رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

جمادی الاول ۱۳۷۷ھ

جلد ۴۹ عدد

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور پاکستان

قیمت سالانہ ۵ر

قیمت فی پرچہ ۴ر

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۹ | جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۷۷ھ - مطابق فروری سنہ ۱۹۵۸ء | عدد ۵

اشارات	ادارہ	۲
مقالات:		
اقوامِ مغرب کا عبرتناک انجام	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۹
اسلامی معاشرہ کو تہذیب جدید کا چیلنج	ڈاکٹر عبدالوہاب عزّام	۲۱
تعزیراتِ اسلامی	پروفیسر مصطفیٰ احمد زرقا	۴۲
رسائل و مسائل:		
مسئلہ اجتہاد کے بارے میں چند شبہات اور اُن کا ازالہ	جناب الفرڈ کینٹ ول سمتھ صاحب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی	۵۳
مطبوعات	اِدارہ	۶۴

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

گذشتہ سال ماہ رجب کے ترجمان القرآن میں ہم نے ضبطِ ولادت کے فتنہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس فتنہ کی آبیاری بڑے ہی باطل اور گمراہ کُن نظریات نے کی ہے اور ان کی تہ میں یہ غلط خیال کارفرما ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات معاذ اللہ بڑی بخیل اور بے رحم ہے۔ اُس نے ایک ایسی زمین پر نسلوں کے پیدا ہونے اور بڑھنے کا سامان کر دیا ہے جس میں ان نسلوں کو پالنے کے لیے کافی سامان نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی اور وسائلِ رزق کو متناسب رکھنے کے لیے قحط اور بیماریاں پھوٹ پڑتی ہیں جنگ و جدال اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا ہے، مگر خالقِ کائنات دُور کھڑے انسانوں کی اس تباہی و بربادی کا تماشا بڑی شانِ بے نیازی سے دیکھتے ہیں اور اُن کو اپنی مخلوق کے مصائب پر قطعاً رحم نہیں آتا۔

اس سلسلہ میں ہم نے یہ گزارش بھی کی تھی کہ اس فکر کی تخلیق میں بہت سے عوامل شامل ہیں۔ انسانیت کے متعلق مایوس کُن اور تاریک تصورات نے اس نظریہ کو جنم دیا، الحاد و زندقہ نے اسے پروان چڑھایا، انسان کی ہوا و حرص نے اسے عروجِ شباب بخشا اور دولت کی ہمہ گیر پرستش اور اُس کے حصول کے لیے مجنونانہ جد و جہد نے اس میں تدریجاً رنگِ تکمیل بھرا۔ اس نظریہ کی بنیاد نظامِ مادہ کے سکون آفریں تصور پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسانیت کو قدرت کے جس قدر عطیات ملنے تھے وہ سب مل چکے ہیں۔ اور اب نوعِ انسانی کو ربِ کائنات سے رزق کے معاملہ میں کسی قسم کی توقع وابستہ نہ کرنی چاہیے۔ اگر وہ زندہ رہنے کی متمنی ہے تو اُس کی عملی شکل اس کے سوا اور کچھ ممکن نہیں کہ وہ افزائشِ نسل کو روکے تاکہ مادہ کی یہ محدود دنیا اُس کے بوجھ کی متحمل ہو سکے۔

اہلِ مغرب کا بعض دوسرے افکار و نظریات کی طرح اس معاملہ میں بھی موقف بڑا عجیب و غریب ہے۔

وہ بحیثیت اصولِ کائنات کے حرکت آفریں تصور کے قائل ہیں، صرف قائل ہی نہیں بلکہ اس کے پُرجوش مبلّغ اور داعی بھی ہیں۔ اسی اصول کی اساس پر انھوں نے اپنے سارے نظریات و تصورات کے محل تعمیر کیے ہیں۔ اسی طرزِ فکر کے تقاضوں کے پیشِ نظر انھوں نے صدیوں کے پرانے افکار و معتقدات کو جھٹلا دیا ہے۔ یہ اسی تصور کی کرشمہ سازی ہے کہ انھوں نے خدا، حشر و نشر، وحی و رسالت ــ الغرض وہ سارے بدیہی حقائق جن کو انسان ہزاروں سالوں سے مانتا چلا آرہا تھا، اور جن کی وجہ سے اُسے روحانی تسکین اور قلبی اطمینان حاصل ہوتا تھا، بغیر کسی دلیل کے رد کر دیئے۔ اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد اُس کے لیے یہ سوچنا بھی ناممکن ہو گیا کہ اس کائنات میں کوئی اصول، کوئی ضابطۂ حیات اور کوئی قانونِ اخلاق ایسا بھی ہو سکتا ہے جس کی پابندی دنیا کے ہر عہد میں کی جا سکتی ہو۔ اس نظریہ کے حامیین کے نزدیک تاریخ ایک مسلسل ہلچل ایک ہمہ گیر اضطراب ہے جس کی ہر لہر نئی شان کے ساتھ ہر لمحہ ابھرتی رہتی ہے۔ زندگی انقلاب و تغیّر کا محض دوسرا نام ہے اور اس کی فطرت میں عدمِ تغیّر یا ثبات و قرار کا کوئی معمولی سے معمولی عنصر بھی شامل نہیں۔ اہلِ یورپ کے یہ نظریات و افکار اُن کے ہاں اس بنا پر مقبول نہیں ہوئے کہ یہ سب ثابت شدہ حقائق ہیں بلکہ ان کی اگر وہاں پرستش کی جا رہی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ سارے تصورات اُن کی زندگی کے اساسی تصور یعنی کائنات کے حرکی (DYNAMIC) نظریہ سے ہم آہنگ ہیں، حالانکہ یہ تصور بذاتِ خود ایک مفروضہ ہے جو حجت و استدلال اور ثبوت کا اسی طرح محتاج ہے جس طرح کوئی دوسرا مفروضہ ہو سکتا۔ مگر اسے یورپ کی ذہنی اپچ کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جس عقیدہ پر اُن کی پوری تہذیب کی عمارت کھڑی ہے، اُسی کو وہ قدرت کے عطیات کے معاملہ میں ماننے سے گریز کرتے ہیں اور مادہ کے متعلق اُس سکون آفریں تصور کے قائل ہیں جس کی نفی پر انہوں نے اپنے سارے افکار و نظریات تعمیر کیے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تاریخِ افکار کا مؤرخ جب مستقبل قریب میں اس ذہنی بحران میں سے گزرنے کے بعد اطمینان اور سکون کی فضا میں مغربی نظریات کی دلچسپ داستان قلمبند کرنے بیٹھے گا تو وہ لازمی طور پر علم و فکر کے بعض دوسرے مضحکہ انگیز "عجائبات" اور "نوادر" میں اس "شاہکار" کو بھی شامل کریگا کہ تاریخ کے ایک روشن دور میں علماء و فضلاء

کا ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوا جو ایک طرف تو اس بات کا دعویدار تھا کہ زندگی پیہم انقلاب اور جاودان تغیر ہے، اس میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جس میں ٹھہراؤ ہو اور اس وجہ سے یہاں کسی بات پر قطعیت اور حتمیت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہی گروہ یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ اس دنیا میں مادی وسائل کی ایک مقدار بالکل مقرر اور معین ہے اور انسان جس نسبت سے اسے استعمال کرتا چلا جائیگا اسی تناسب سے قدرت کے یہ خزائن کم ہوتے رہیں گے اور انسانیت اپنی بقا کے لیے مجبور ہوگی کہ وہ افزائشِ نسل کو روک دے۔ پھر طرفہ یہ کہ یہی گروہ اپنے فکر و نظر کے بارے میں اس بات کا بھی مدعی ہوا کہ کسی نظامِ فکر کے مختلف اجزائے ترکیبی کا باہمی ربط و تطابق ہی اس کی صداقت کا واحد معیار ہے اور جس نظام میں یہ چیز موجود نہ ہو وہ سراسر باطل ہے۔ ممکن ہے آج ہمیں یورپ کا یہ فکری تضاد اچھی طرح نظر نہ آتا ہو، مگر عنقریب جب حالات ذرا معمول پر آئیں گے تو لوگ اس کو یقیناً بڑی شدت سے محسوس کریں گے۔

اگر آپ اصل صورتِ حال کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مستقبل کے امکانات کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ علمِ الٰہی میں اگرچہ مستقبل معین ہے مگر فعلیت اور تخلیق کے لحاظ سے اس کا ایک ایک لمحہ باری باری حال کے مقام پر جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔ قانون بقائے مادہ سے مراد یہ نہیں کہ پہلے سے مستقبل کا نظامِ حوادث عملاً تشکیل پا چکا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو ایک سوچنے والا ذہن اور ایک دلِ بیتاب اس لیے دیئے ہیں کہ وہ ایک طرف نئے نئے مقاصد کی تخلیق کرتا چلا جائے اور دوسری طرف ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اس آب و گل کی دنیا سے اسباب فراہم کرنے کے انتظامات کرے۔ انسان کو خداوند تعالیٰ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ عالمِ مادی کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالے، اس کے مفید پہلوؤں سے پورا پورا استفادہ کرے اور اس کے مضر اثرات سے اپنی حفاظت اور پاسبانی کرے۔ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ باوجود تمام علمی و فکری ترقیوں کے انسان یہ محسوس کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ فطرت میں اس کے تصرف کی ایک حد ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن وہ کونسی حد ہے

اس کا تعین کرنا ہمارے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب ناممکن ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں بعض دون ہمت انسانوں نے یہ کہا کہ اب انسان اس آخری سرحد پر پہنچ چکا ہے جس کے بعد قدرت کے خزانوں سے مزید کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا اور اسی بنا پر انھوں نے انسانیت کے مستقبل کی نہایت ہی تاریک اور گھناؤنی تصویر پیش کی۔ انھوں نے نوعِ انسانی کو بڑے سنسنی خیز اعداد و شمار بتا کر خوف زدہ کرنا چاہا۔ لیکن بعد میں آنے والے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ان لوگوں کے سارے اندازے بالکل غلط تھے۔ کیا مالتھس کے نظریۂ آبادی کو تاریخ کے واضح حقائق نے جھٹلا نہیں دیا؟ کیا قانونِ تقلیلِ حاصل کی اثر آفرینی کو انسان کی قوتِ فکر و عمل نے بہت حد تک کم نہیں کر دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان جب طاقت کے زعم میں آکر خدائی کے دعوے کرنے لگتا ہے تو عین اس وقت قدرت اس کے ان باطل دعووں پر مسکراتی ہوئی اسے کوئی ایسی سزا ضرور دیتی ہے جس سے اس پر اپنی حقیقتِ حال واضح ہو جائے اور اسے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا احساس ہونے لگے مگر دوسری طرف وہ جب عالمِ مادی کی جکڑبندیوں سے گھبرا کر ہمت توڑ بیٹھتا ہے اور کائنات اور اس کے خالق کے متعلق نہایت ہی مایوس کن افکار اپنے دل و دماغ میں پالنے شروع کر دیتا ہے تو انسان کے اس غلط طرزِ عمل پر بھی فطرت خندہ زن ہو کر کچھ ایسے اسباب بالفعل پیدا کر دیتی ہے جن سے اس پر اپنے اندازوں کی عدمِ صحت کا راز منکشف ہو جاتا ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہوتا کہ کوئی علیم و خبیر ذات، کوئی طاقت و قوت کی مالک ہستی ایسی بھی ہے جو اس کائنات اور اس کے انتظام و انصرام کو ایک تدبیر اور نظم کے ساتھ چلا رہی ہے۔ جس کی حکمتیں اس کے منصوبوں پر حاوی ہیں، جس کے علم میں وہ سب امکانات موجود ہیں جو عالم میں تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں۔

ہم اس بات کا تو دعویٰ نہیں کرتے کہ اہلِ یورپ نے اب ہستیٔ باری تعالیٰ کا اقرار کر لیا ہے لیکن ہم یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ پچھلے چند سالوں کے واقعات نے ان کے افکار میں ایک تلاطم پیدا کر دیا ہے۔ وہ سارے افکار و نظریات جن کو وہ کبھی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، جن پر ان کا ایمان وحی اور الہام سے بھی زیادہ پختہ تھا اور جن کی بنیاد پر انھوں نے اپنی تہذیب کا قصر اٹھایا تھا، ان کے بارے میں

بھی وہ اب نظرِ ثانی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ ہر وہ انسان جس نے یورپ کے جدید رجحانات کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیا ہے وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے۔ ہمارے لیے فکر و نظر کی اس تبدیلی کی ساری تفصیلات کا ذکر کرنا تو مشکل ہے۔ ہم یہاں مالتھس کے نظریۂ آبادی کے صرف ایک پہلو کا تذکرہ کرتے ہیں۔

وہ لوگ جنھوں نے آبادی کے اس نظریہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ سارا نظریہ قدرت کی بخیلی کے گمراہ کن تخیل پر قائم ہے اس کی رُو سے قدرت کے ذرائع کی ایک مقدار معین اور مقرر ہے۔ انسان فطرت کے دیئے ہوئے ان عطیات سے جس قدر فائدہ اٹھائے گا، اسی نسبت سے ان میں کمی ہوتی رہیگی اور اس طرح انسانیت ناگزیر طور پر غربت اور افلاس کے خطرناک غاروں کی طرف بڑھتی چلی جائے گی یہ ہے مختصراً وہ تصور جو مالتھس اور اس کے مقلدین اس کائنات کے بارے میں سالہا سال سے پیش کر رہے ہیں اور جس کی وجہ سے یورپ میں فکر و نظر کی ایک ایسی مغموم فضا تیار ہو گئی ہے جس میں انسانیت پر ہر لحظہ بھوک افلاس، غربت اور بیماری کا خوف چھایا رہتا ہے اور اسی قسم کے خیالی بھوتوں سے خوفزدہ ہو کر وہ قتلِ اولاد جیسے انسانیت سوز فعل پر آمادہ ہو گئی ہے۔

اسے انسانیت کے حق میں ایک فالِ نیک کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اسی قسم کی تاریک فضا اور افسردہ ماحول میں پیدا ہونے کے بعد بھی کوئی شخص اپنے ذہنی توازن کو برقرار رکھے اور صورتِ حال کا جائزہ لینے میں کسی حد تک حقیقت پسندی کا ثبوت دے۔ اسی قسم کی ایک کوشش کا تذکرہ ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

چند روز ہوئے پنجاب یونیورسٹی میں ملکولیم کے فوراً بعد ایک معاشی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں جو مقالات پڑھے گئے اُن میں زیادہ تر انہیں خیالات و تصورات کو پیش کیا گیا، جنھیں یورپ میں قبولِ عام حاصل ہے۔ مگر انہیں مقالات میں ایک مقالہ ایسا بھی سُنا گیا جو کافی حد تک فکر انگیز تھا اور جس میں

پٹے ہوئے راستوں سے ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی تھی مقالہ نگار کوئی ملا نہ تھے کہ ان کے خیالات پر "تاریک خیالی" کی چھاپ لگا کر ہمارے روشن خیال لوگ فوراً رد کر دیتے بلکہ اس کے مصنف یورپین تہذیب کے ایک گل سرسبد ہیں۔ اس لیے ہمارے تجدد پسند اصحاب کو جن کے نزدیک خوب و ناخوب کا معیار صرف مغرب ہے، ان خیالات کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ وہ مالتھس اور ریکارڈو کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یاس و قنوطیت کے یہ پراپیگنڈہ کرنے والے برسرِ حق نہیں۔ قدرتی ذرائع کے متعلق سوچنے کا ایک حقیقت پسندانہ انداز بھی ہے جس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ نوعِ انسانی کا معیارِ زیست مسلسل بڑھایا جا سکتا ہے۔ ذرائع موجود نہیں ہوتے بلکہ وہ بنتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس حقیقت کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ یہ انسان کا علم ہی ہے جو قدرت کے عطیات کو انسانیت کے استعمال کے قابل بناتا ہے۔ اور علم کوئی جامد چیز نہیں، بلکہ یہ ہر آن ترقی کرتا رہتا ہے"

"انسان قدرت کے ان ذرائع سے پچاس ہزار سال سے برابر فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لیکن آج دنیا کی جس قدر آبادی ہے، نہ تو کبھی پہلے اتنی آبادی ہوئی تھی۔ اور نہ ہی اسے وہ معیارِ زیست میسر آیا تھا جو موجودہ دور کے لوگوں کو حاصل ہے۔ اگر ہم کلاسیکی معاشیین کی ہمنوائی میں یہ تسلیم کر لیں کہ زمین کے طبیعی خواص میں پچاس ہزار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا تو اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسانیت آج تک صرف اپنے پیدائشی حق پر ہی گذر بسر کرتی رہی ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ آج کا انسان پانچ سو سال پہلے کے انسان کی بہ نسبت زیادہ وسائلِ رزق رکھتا ہے۔ اس کے علمی و عملی کمالات نے قدرت کے عطیات کو اس کے لیے مفید بنا دیا ہے۔ جس تناسب سے یہ ذرائع کم ہوتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ سرعت کے ساتھ انسان ان میں اضافہ کر لیتا ہے۔ پروفیسر زمرمان کے الفاظ میں علم ہی تمام ذرائع کی کلید ہے۔ آج کے انسان اور اس دور کے انسان کے درمیان جو جانوروں کا شکار کر کے اپنی گزر اوقات کرتا تھا، فرق صرف علم کا ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان کو آرام و آسائش میسر ہوئی ہے . . . . ہنرمندی اور ذہانت، جو علم کی حقیقی اساس ہیں"

وہی دراصل سارے ذرائع کا سرچشمہ ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ذرائع کا تصور سراسر حرکت آفریں ہے اور اسے انسانی احتیاجات اور اس کی صلاحیتوں سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

پھر ذرائع سے مراد وہ مادی اور محسوس اشیاء ہی نہیں جو قدرت نے ہمیں عطا کی ہیں۔ صحت، معاشرتی ہم آہنگی، صحیح اور عقلمندانہ فیصلے، علم، آزادی اور حریت بھی انہیں ذرائع میں شامل ہیں اور یہ چیزیں سونے چاندی، لوہے اور کوئلے سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ دراصل ذرائع ان سارے عناصر کے باہمی امتزاج ہی سے معرض وجود میں آتے ہیں۔

سخت نادان ہیں وہ لوگ جو ذرائع کو کسی گودام میں رکھے ہوئے خام مال کا محض ایک ڈھیر خیال کرتے ہیں۔ وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جتنی جلدی ہم ان ذرائع سے استفادہ کریں گے، اتنی ہی سرعت کے ساتھ یہ ذرائع کم ہوتے چلے جائیں گے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ان کے یہ احساسات بالکل غلط ہیں۔ قدرت کے عطا کردہ مال ومتاع کا وہ جہان جس میں اس نے سب سے پہلے آنکھ کھولی وہ ایک نہ تھا بلکہ ایک لمبے سلسلہ کی بالکل ابتدائی کڑی تھی۔ جب اس نے فطرت کے ان عطیات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرلی، تو وہ خود بخود اس قابل ہوگیا کہ اسی طرح کے دوسرے جہانوں کی تلاش کرے۔ وہ جوں جوں ان کو مسخر کرتا چلا گیا اس کے سامنے سے کائنات کے بہت سے اسرار ورموز کے پردے خود بخود ہٹتے چلے گئے۔ اسے ہر منزل پر یہ احساس ہوا کہ سامانِ زیست کے آئے ہوئے بے شمار کرے ابھی ایسے بھی ہیں جن پر تالے پڑے ہوئے ہیں اور وہ سراپا انتظار ہیں کہ کوئی ذہین وفطین انسان آئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے انہیں وا کرے اور ان کی چھت کے نیچے جو کچھ موجود ہے اسے نوع انسانی کی فلاح وبہبود پر نچھاور کردے۔

یہ وسیع وعریض کائنات جس کی پہنائیوں کی کوئی حد نہیں، یہ ساری کی ساری ان ذرائع کی ترجمان ہے جو انسان کو اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے خالق کائنات نے ودیعت کیے ہیں۔

ذرائع ووسائل کا یہ حرکت آفریں تصور ایشیا اور اسی طرح کے دوسرے پسماندہ علاقوں

رباتی ملاحظہ ۲۱۶ پر

اقوامِ مغرب کا عبرت ناک انجام

(مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

[ترجمان القرآن کے پچھلے پرچوں کا مطالعہ کرتے ہوئے جلد ۱۵ ۔عدد ۱ بمطابق رجب ۱۳۵۸ھ (ستمبر ۱۹۳۹ء) کے پرچہ میں اشارات کے صفحات کو بالکل خالی پایا۔ اس چیز کو دیکھ کر فطری طور پر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کی وجہ معلوم کی جائے۔ چنانچہ اس سے اگلے شمارہ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلا کہ یہ اشارات جنگ کے بارے میں تھے جنھیں اُس وقت کی حکومتِ پنجاب نے شائع کرنے کی اجازت نہ دی تھی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے یہ اشارات ترجمان القرآن میں آج تک نہیں چھپے۔ ترجمان القرآن کی وہ فائیل جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنے پاس رکھتے ہیں اُس میں مولانا نے خود اپنے ہاتھ سے ان خالی صفحات میں ان اشارات کو درج کیا ہے۔ ہم آج سے تقریباً ۱۹ سال پہلے کے لکھے ہوئے یہ اشارات ایک تاریخی دستاویز کے طور پر ان صفحات میں شائع کرتے ہیں ——— نائب مدیر]

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔

آخر کار وہ فساد جس کا مادہ مدتوں سے پک رہا تھا، زمین پر پھوٹ پڑا اور اُس نے خشکی اور تری اور ہوا سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جن مفسد انسانوں اور متاعِ حیاتِ دنیا کی حریص جماعتوں کے ہاتھ میں اس وقت عالمِ انسانی کی باگیں ہیں، ان کے کرتوت آخر کار عذابِ الٰہی کی صورت میں نہ صرف خود اُن پر مسلط ہو کر رہے، بلکہ اس دنیا کو بھی انھوں نے آگھیرا جس نے خدا کی بندگی چھوڑ کر ان مفسدوں کی بندگی قبول کر رکھی ہے۔ اب زمین پر وہ سب کچھ ہوگا جس پر خدا نے لعنت بھیجی ہے۔ بستیاں غارت ہونگی کھیتیاں اور نسلیں تباہ کی جائیں گی۔ انسان کو انسان بھیڑیوں سے بھی زیادہ درندگی کے ساتھ پھاڑے اور چیرے گا۔ بچوں اور عورتوں اور بوڑھوں اور بیماروں

تک کو امان نصیب نہ ہوگی۔ انسان نے صدیوں میں جو کچھ اپنی محنت اور ذہانت سے بنایا ہے وہ آن کی آن میں بگاڑ کر رکھ دیا جائے گا۔ کمزور قوموں کے آدمی زمین کے ہر گوشے سے کھینچ کھینچ کر لائے جائیں گے اور شیاطین مغرب کی قربانگاہ حرص و ہوس پر ان کو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ذبح کرا دیا جائے گا۔ غریب اور بے بس قوموں کی گاڑھی کمائیاں طرح طرح سے سونتی جائیں گی اور ان کو اس آتشبازی میں پھونک دیا جائے گا جو زمین کی خداوندی کے جھوٹے مدعیوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں شروع کی ہے۔ غرض اب نوع انسان کے لیے اپنے اس گناہ کی پوری سزا پانے کا وقت آگیا ہے کہ اس نے اُن سرکشوں کو اپنا مُطاع اور پیشوا بنایا جو خدا کو بھولے ہوئے ہیں اور شیطان کی بندگی میں حد سے گزر گئے ہیں۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ۔

ابھی اس فسادِ عظیم کو صرف ۱۲ سال ہی گزرے ہیں جس نے پورے چار برس تک دنیا کو تہ و بالا کر رکھا تھا۔ ایک کروڑ آدمیوں کا ہلاک اور تین کروڑ کا زخمی ہونا، ۱۰ کھرب روپے کے سرمایے پر پانی پھر جانا، ملکوں اور سلطنتوں کا تباہ ہونا، اور دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک قوموں کی اخلاقی و روحانی اور تمدنی و سیاسی زندگی میں ایک شدید بحرانی کیفیت کا پیدا ہو جانا، یہ اُس فتنۂ کبریٰ کے نتائج تھے جسے دنیا جنگِ عظیم کے نام سے یاد کرتی ہے۔ مگر اتنے بڑے ہولناک حادثہ سے بھی یورپ کے خدانا شناس اربابِ سیاست کی آنکھیں نہ کھلیں اور انھوں نے چند ہی سال بعد ایک دوسرے اور عظیم تر فتنہ کا جھنڈا بلند کر دیا۔ درآنحالیکہ ابھی پچھلے فساد کے دل دہلا دینے والے نتائج ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ یہ دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے دل کی آنکھیں بالکل اندھی ہو چکی ہیں، وہ اپنی روح شیطان کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں، اور اب یہ کسی چیز سے عبرت و نصیحت حاصل نہ کریں گے یہاں تک کہ قضائے الٰہی ان کے شر اور ان کی سرکشی کی جڑ کاٹنے کا آخری فیصلہ کر دے اور انھیں خود ان کے ہاتھوں سے اس طرح تباہ و برباد کرا دے کہ یہ آئندہ نسلوں کے لیے افسانہ بن کر رہ جائیں۔ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ۔

یورپ کے مدبرینِ سیاست کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ اندر ہی اندر فتنہ انگیزیاں کرتے رہتے ہیں، اور دوسری طرف جب ان کی شرارتوں کا میگزین پھٹنے پر آتا ہے تو ان میں

سے ہر ایک اصلاح اور امن پسندی کا مدعی، حق و انصاف کا حامی اور ظلم و زیادتی کا دشمن بن کر اٹھتا ہے اور دنیا کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ میں تو صرف خیر و صلاح چاہتا ہوں، مگر میرا مد مقابل ظلم و بے انصافی پر تلا ہوا ہے لہٰذا آؤ اور میری مدد کرو۔ حقیقت میں تو یہ سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ سب ظلم و فساد کے امام ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا دامن مظلوموں کے خون سے سرخ ہے۔ ہر ایک کا نامۂ اعمال ان سب گناہوں سے سیاہ ہے جن کا الزام یہ ایک دوسرے پر لگاتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی پرانی عادت ہے کہ جب یہ اپنی مفسدانہ اغراض کے لیے لڑتے ہیں تو اخلاق اور انسانیت اور جمہوریت اور کمزور قوموں کے حقوق کی حمایت کا سراسر جھوٹا دعویٰ لے کر دنیا کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ وہ بہت سے بے دہ خوف انسان جو ان کے قبضۂ قدرت میں ہیں، ان کی لڑائی کو حق اور انصاف کی لڑائی سمجھ کر ان کی ناپاک خواہشات کے حصول میں مددگار بن جائیں، اور وہ بہت سے خوشامدی لوگ جو اپنی ذلیل اغراض کے لیے ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں، اپنے آپ کو ایک مقصدِ حق کا حمایتی بنا کر پیش کریں اور سُرخ رو بن جائیں۔

فساد انگیزی کے ساتھ اناعتن مصلحون کے ان جھوٹے دعووں کی حقیقت پچھلی جنگ میں پوری طرح کھل چکی ہے۔ جنگِ عظیم کی تاریخ آج کسی سے پوشیدہ نہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ ایک طرف انگلستان، فرانس، روس اور اٹلی، اور دوسری طرف جرمنی اور آسٹریا کی جتھہ بندی کن اغراض کے لیے ہوئی تھی۔ کس قسم کے مفاد تھے جن کے لیے یہ دونوں جتھے ایک دوسرے کے مقابل لڑنے پر آمادہ ہوئے تھے، اور پھر ملکوں کی تقسیم اور سلطنتوں کے بٹوارے کی کیا کیا سازشیں انھوں نے آپس میں کی تھیں۔ مگر کچھ یاد ہے کہ جنگ کے آغاز میں اور جنگ کے دوران میں ہر فریق کیسے کیسے بلند بانگ دعووں کے ساتھ دنیا کو یہ فریب دینے کی کوشش کی تھی کہ ہم دنیا کو ظلم و ستم کے تسلط سے بچانے اور ضعیف قوموں کو آزادی کی نعمت سے بہرہ اندوز کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں؟

پھر جب لڑائی میں ایک فریق کو فتح نصیب ہوئی تو اس نے کس طرح اپنے وعدوں اور معاہدوں کو پورا کیا؟ اپنی حق پرستی اور انصاف پسندی کی کیسی روشن مثالیں پیش کیں؟ ضعیف قوموں پر آزادی کی نعمت، اور مظلوم انسانیت پر عدل کی رحمت کس کس طرح برسائی؟ اس کی شہادت ہندوستان، عراق،

شام، فلسطین، مصر، سمرنا، تھریس، ٹیونس، الجزائر، اور مراقش کا ایک ایک ذرہ دے رہا ہے۔

اب یہ لوگ پھر وہی خرقۂ سالوس پہن کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس جنگ کے میدان میں ہم کسی خود غرضی کی بنا پر نہیں کُودے ہیں بلکہ ان اصولوں کی حفاظت کے لیے کودے ہیں جو تمام عالمِ انسانی کی فلاح سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا مقصد بین الاقوامی عدل اور بین الاقوامی اخلاق کو تباہی سے بچانا ہے۔ ہم یہ اصول دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں کہ مہذب انسان اپنے اختلافات کا فیصلہ معقولیت اور استدلال سے کرے نہ کہ حیوانی قوت کے زور سے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ انسانوں کے معاملات میں جنگل کا قانون جاری نہ ہونے پائے، یعنی ایسا نہ ہو کہ بلا لحاظ حق و انصاف ہر طاقت ور کی بات کمزور کو ماننی پڑے۔ اگر ہم ان مقاصدِ عالیہ کے لیے جنگ نہ کریں تو دنیا میں مہذب انسانوں کی زندگی دوبھر ہو جائے گی، انسانی روح کے لیے کوئی آزادی باقی نہ رہے گی اور انسانی تہذیب و تمدن کے پُرامن نشوونما کا راستہ بند ہو جائے گا۔ کیونکہ ہمارا مدِمقابل جبر و زور کی بالاتری قائم کرنے کے لیے جو کچھ کر رہا ہے اس کے کامیاب ہو جانے کے معنی انسانی تہذیب کی کامل بربادی کے ہیں۔

یہ وعظ سُن کر بے اختیار منہ سے نکلتا ہے:

آتنا نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

اللہ اللہ! جناب اور بین الاقوامی عدل؛ جناب اور بین الاقوامی اخلاق! یہ انسانی روح کی آزادی کس تاریخ سے جناب کی نگاہ میں اس قدر عزیز ہو گئی کہ اس کے لیے آپ اپنا مال اور اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے؟ آپ نے کب سے یہ اصول تسلیم فرما لیا کہ مہذب انسان اپنے اختلافات کا فیصلہ حیوانی قوت کے بجائے معقولیت اور استدلال سے کرے؟ جنگل کا قانون آپ کے حدودِ اختیار میں کس روز منسوخ ہوا اور کب وہ ساعتِ سعید آئی کہ کمزور کے مقابلہ میں جنابِ والا حق و انصاف کا لحاظ فرمانے لگے؟ فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ۔ آپ کے تو نامۂ اعمال کا ورق ورق ان تمام جرائم کی شہادت دے رہا ہے جن کے سدِباب کا آج آپ اعلان فرما رہے ہیں۔ آپ کے وسیع

مقبوضات گواہ ہیں کہ دنیا میں جنگل کا قانون نافذ کرنے والے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر آپ ہیں۔ آپ کی جہانگیرانہ تاریخ کا صفحہ صفحہ اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ بین الاقوامی عدل اور بین الاقوامی اخلاق کو اپنی تجارتی اور سیاسی اغراض پر قربان کرنے میں آپ نے کبھی دریغ نہیں کیا اور جہاں آپ کی حیوانی قوت کا زور چل سکا وہاں آپ نے کبھی یہ اصول تسلیم نہ کیا کہ مہذب انسان کو اپنے اختلافات کا فیصلہ معقولیت اور استدلال سے کرنا چاہیے۔ پچھلی تاریخ کو چھوڑیے۔ آج عین اس وقت جبکہ حضور کی زبانِ مبارک سے ان مقاصدِ عالیہ کا اعلان ہو رہا ہے، آپ کے اپنے ہاتھوں سے فلسطین میں وہ سارے مقاصد پامال ہو رہے ہیں جن کی حمایت کا آپ دعویٰ فرماتے ہیں۔ یہ نئے اور پرانے دھبے اپنے دامن پر رکھتے ہوئے جناب کا اظہارِ پاک دامنی اندھوں کو تو دھوکا دے سکتا ہے مگر آنکھوں والے دھوکا نہیں کھا سکتے۔ یہ کاٹھ کی ہنڈیا آخر کب تک چڑھتی رہے گی؟ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ۔

یہ جنگ جواب شروع ہوئی ہے اس کے اسباب کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ اس کی بنا اسی روز رکھ دی گئی تھی جس روز پچھلی جنگ ختم ہوئی تھی۔ آج جو حق و انصاف اور بین الاقوامی عدل کے مدعی بن کر اٹھے ہیں انھوں نے پچھلی جنگ میں فتح حاصل کرتے ہی دنیا میں "جنگل کا قانون" نافذ کر دیا تھا۔ انھوں نے ملکوں کا اس طرح بٹوارا شروع کیا جس طرح ڈاکو مال لوٹنے کے بعد آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔ انھوں نے قوموں کو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح آپس میں بانٹا اور ان کا لین دین کیا۔ یہ اُس وقت اپنے دورانِ جنگ کے بلند بانگ دعوے سب بھول گئے اور انھوں نے ٹھیک اسی طرح مغلوب قوموں کے ساتھ برتاؤ کیا جس طرح جنگل میں کوئی درندہ اپنے شکار کے ساتھ کرتا ہے، یعنی بلا لحاظ حق و انصاف محض طاقت کے بل پر کمزور کو اپنے فیصلے کے آگے جھکنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے زندہ اور احساسِ خودداری رکھنے والی قوموں کے سر اور سینہ پر اتنی ٹھوکریں لگائیں اور لگاتے چلے گئے کہ بالآخر وہ جوشِ غضب سے دیوانی ہو گئیں۔ انھوں نے اپنا دماغی توازن کھو دیا اور ان پر ایک شدید انقلابی بحران طاری ہو گیا۔ اسی بحران کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف وہ ترکی قوم جو پانسو برس تک مسلم دنیا کے ساتھ گہرے روحانی رابطوں

میں بندھی ہوئی تھی، ایک سخت قسم کے قوم پرستانہ مسلک کی پیرو بن گئی اور اب تک اس کا توازن درست نہیں ہو سکا ہے۔ دوسری طرف اسی بحران کی بدولت وہ عظیم الشان جرمن قوم جو دورِ جدید میں سائنس اور فلسفہ اور علومِ اجتماع کی علمبردار رہی ہے، اور جس کے تہذیبی کارنامے اس عہد کی تاریخ میں سب سے زیادہ درخشاں ہیں، قوم پرستی کے انتہائی سخت جنون میں مبتلا ہو گئی اور اس نے اپنے آپ کو اس جاہلانہ فلسفۂ حیات اور اس جابرانہ نظامِ سیاسی کے سپرد کر دیا جس کو معمولی حالات میں دنیا کی کوئی مہذب، تعلیم یافتہ اور صاحبِ عقل و بصیرت قوم قبول نہیں کر سکتی۔

پس جرمنی میں نازیت کا عروج اور اس پر جبر و قہر و استبداد کے دیوتا کا تسلط اور اس پر جنگجوئی و جہانگیری کے بھوت کا غلبہ براہِ راست نتیجہ ہے اُن لوگوں کی حد سے بڑھی ہوئی حرص و ہوس کا، جو آج دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم بین الاقوامی عدل قائم کرنے اور جنگل کے قانون کو مٹا کر اخلاق اور تہذیب کا قانون نافذ کرنے اُٹھے ہیں۔ یہ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ کی تفسیر ہے اور یہ تفسیر اب آگ اور خون سے لکھی جا رہی ہے۔

اور اب بھی یہ دعویٰ سراسر باطل ہے کہ انھوں نے اپنی حرص و ہوس کے نتائج کو محسوس کر لیا ہے اور اس سے ہاتھ اٹھا کر اب یہ صرف اس لیے لڑ رہے ہیں کہ بین الاقوامی عدل قائم ہو۔ بین الاقوامی عدل تو کئی سال سے ان کی آنکھوں کے سامنے پامال ہو رہا ہے۔ چین، حبش، البانیا، آسٹریا، بوہیمیا، اسپین میں ہر ایک اس کی پامالی کا نوحہ خواں ہے۔ پھر ان میں سے کسی موقع پر انصاف پسندی اور حمایتِ تہذیبِ انسانی کی رگ کیوں نہ پھڑکی؟ کیا انسان صرف پولینڈ ہی میں بستے ہیں کہ صرف انہی کو جنگل کے قانون سے بچانے کی ضرورت لاحق ہوئی ہے اور وہ کروڑوں چینی، حبشی، البانوی اور چیک وغیرہ انسان نہ تھے کہ جنگل کا قانون ان پر ٹھنڈے دل سے نافذ ہو جانے دیا گیا؟

صاف کیوں نہیں کہتے کہ اصل معاملہ مقبوضات ماوراءِ بحر کا ہے اور خطرہ دراصل یہ ہے کہ پولینڈ پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد جرمنی پہلے اپنی ان نو آبادیات کا مطالبہ کرے گا جو پچھلی جنگ میں اس سے چھین لی گئی تھیں اور پھر دنیا کے وسیع عرصۂ حیات میں جہاں اب تک آپ ہی کی کبریائی کا ڈنکا بج رہا ہے،

یہ نئی ابھرنے والی طاقت آپ کی برتری کو چیلنج کرے گی۔ لہٰذا آپ چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے کہ یہ اس طرف پیش قدمی کرے، دروازے ہی پر اسے کیوں نہ روک دو۔ یہ ہے اصل غرض میدانِ جنگ میں کودنے کی، نہ کہ اس انسانیت کی حفاظت و حمایت جس پر جنگل کا قانون پہلے ہی نافذ ہو چکا ہے اور ڈیڑھ صدی سے نافذ چلا آرہا ہے۔

پھر جبکہ لڑائی کی اصلی غرض یہ ہے تو دنیا سخت احمق ہو گی اگر وہ اس جنگ کے متعلق یہ سمجھے گی کہ ایک طرف حق ہے اور دوسری طرف باطل۔ حقیقت میں دونوں طرف باطل ہی باطل ہے۔ حق اور انصاف کا کسی فریق کے مقاصدِ جنگ میں شائبہ تک نہیں۔ دونوں فریق اپنی اپنی اغراض کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ایک چاہتا ہے کہ جن انسانوں پر میں جنگل کا قانون نافذ کر چکا ہوں، اب ان پر کوئی دوسرا اس قانون کو نافذ نہ کرنے پائے۔ دوسرا چاہتا ہے کہ جہاں یہ قانون پہلے سے نافذ ہے وہاں اس کا نفاذ ایک دفعہ پھر ہو جائے۔ اس صورتِ حال میں اگر کوئی فریب خوردہ انسان کسی فریق کو برسرِ حق سمجھتا ہے تو خدا اس کی عقل پر رحم کرے۔ اور کوئی فریب کار انسان حقیقتِ واقعہ کو جاننے کے باوجود اپنی ناپاک اغراض پر حق پسندی کا خوشنما پردہ ڈالتا ہے تو خدا اس کا پردہ کھول دے۔

اس عجائب کی دنیا میں شائد اس سے زیادہ عجیب کوئی بات نہیں ہے کہ جہاں ڈیڑھ صدی سے جنگل کا قانون نافذ ہے اور جن لوگوں کے ساتھ معقولیت اور استدلال کے بجائے ہمیشہ حیوانی قوت ہی کے زور سے اختلافات کا فیصلہ کیا جاتا رہا ہے وہاں ٹھیک انہی لوگوں سے آج کہا جا رہا ہے کہ ہم اس جنگل کے قانون اور اس حیوانی طریقِ عمل کو مٹانے جا رہے ہیں، آؤ ہماری مدد کرو۔ جو لوگ خود انسانی آزادی سے محروم اور طاقت کی حکمرانی سے مغلوب ہیں۔ ان کو پکارا جاتا ہے کہ انسانی آزادی کی حفاظت کے لیے اور طاقت کی حکمرانی ختم کرنے کے لیے اپنی جان و مال قربان کرو۔ اور پھر انھیں بے وقوف بناتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"یہ اعلیٰ درجہ کے اصول (جن کو قائم کرنے کے لیے ہم لڑ رہے ہیں) ہندوستان سے بڑھ کر دنیا میں کہیں قدر و عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے، اور ہندوستان سے زیادہ کسی نے

ان کی حفاظت کو اہمیت نہیں دی ہے . . . . . اور ہمیں پورا بھروسا ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ وہ سب کچھ خطرے میں ہے جو انسانی تہذیب کے لیے نہایت قیمتی ہے، ہندوستان طاقت کی حکمرانی کے مقابلہ میں انسانی آزادی کی حمایت پر اپنا زور صرف کرے گا اور اُس مرتبہ کے شایانِ شان اس کام میں حصہ لے گا جو اسے دنیا کی بڑی قوموں اور تاریخی تہذیبوں میں حاصل ہے "

کیا خوب ارشاد ہے! اس کا ایک ایک لفظ اس قابل ہے کہ "اخلاقی جسارت" کی زرین مثال کے طور پر تاریخ میں محفوظ کر دیا جائے۔

عین اس وقت جبکہ یہ پیغام ہندوستان کو دیا جا رہا تھا، ہندوستان کے کمانڈر انچیف صاحب چیٹ فیلڈ رپورٹ پر تقریر کرتے ہوئے فرما رہے تھے کہ "ہندوستان کی اصلی سرحدیں ایک طرف ملایا اور سنگاپور ہیں اور دوسری طرف مصر و عدن اور خلیج فارس۔ یہ ممالک اگر ہندوستان کے دوستوں کی ملکیت میں نہ ہوں تو سمجھو کہ اس ملک کے سینے پر دو طرف سے پستول کی شست بندھی ہوئی ہے۔"

دفاع کا یہ نظریہ کہ ایک ملک کی قدرتی سرحدوں سے سینکڑوں ہزاروں میل آگے اس کی سیاسی اور دفاعی سرحدیں قائم کی جائیں، اور پھر یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ وہ سرحدیں اس ملک کے "دوستوں" کے قبضہ میں رہیں، یا تو براہ راست ان پر قبضہ کر لیا جائے یا ان کی حکومتوں کو اپنے زیر اثر لایا جائے۔ یہی قیصریت اور جہانگیری کی جان ہے، یہی بس کی گانٹھ ہے، یہی لڑائیوں کی بنیاد ہے، اسی سے ان مفادات اور واجبات کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ پیدا ہوتا ہے جن کی حفاظت اور بجا آوری کے لیے ایک امپیریلسٹ طاقت اپنی حدود سے بڑھتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ اسے پورا اطمینان اس وقت تک نصیب نہیں ہوتا جب تک کہ تمام روئے زمین کو وہ اپنے "دوستوں" کے قبضہ میں نہ دیکھ لے۔ کیونکہ جن مقامات کو وہ اپنی سرحد قرار دیتی ہے، ان کے تحفظ کے لیے ہزار دو ہزار میل اور آگے ایک سرحد قائم ہوتی ہے، اور پھر وہ اپنی حفاظت کا مطالبہ کرتے ہیں جس کی خاطر پھر سرحدیں ہزار دو ہزار میل آگے بڑھ جاتی ہیں

یہ جہانگیرانہ نظریات اس وقت بھی ان لوگوں کے دماغ میں چکر لگا رہے ہیں جبکہ یہ دنیا کو یقین

دلا رہے ہیں کہ ہم ایک دشمن انسانیت کی خبگھوئی کا سر کچلنے جارہے ہیں۔ اس کے بعد اس امر میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے کہ ان میں اور ان کے حریف میں اخلاقی حیثیت سے کوئی فرق نہیں۔ انسانیت کے لیے دونوں میں ایک کو انتخاب کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ دونوں کے نظریات ایک، اصول ایک، مقاصد ایک، اور طرزِ عمل ایک۔ پھر آخر وجہ ترجیح کیا ہے؟

جو لوگ اپنے کچھ اصول نہیں رکھتے بلکہ حالات کے لحاظ سے شخص یا قومی اغراض کے لیے سودا کرتے ہیں ان کا راستہ تو تاریکی میں ہے، اور وہ اسی راستہ کو ٹٹول ٹٹول کر چلیں گے۔ مگر مسلمان کا راستہ بالکل صاف ہے۔ اس کا مسلمان ہونا ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے لیے ایک اصول، ایک ضابطہ ایک قانون رکھتا ہے۔ دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے، مسلمان کا کام اپنے اصول کی پابندی کرنا ہے۔ اس سے ہٹنے کے معنی اُن لوگوں میں جا ملنے کے ہیں جو اصولِ اسلام سے ہٹے ہوئے ہیں۔

ایک بنیادی اور اصولی بات جو مسلمان کے حق میں قرآن نے ہمیشہ کے لیے طے کر دی ہے وہ یہ ہے کہ:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ — اللہ نے مومنوں سے ان کی جان و مال کو جنت کے معاوضہ میں خرید لیا ہے۔

یعنی مومن ایمان لانے کے ساتھ ہی خدا کے ہاتھ فروخت ہو چکا۔ اب وہ اپنی جان و مال کا مختار نہیں رہا کہ جہاں چاہے اس بکی ہوئی چیز کو پھر فروخت کر دے یا اسے ضائع کر دے۔ اس کی جان اور مال خدا کی ملک ہے اور وہ خدا کی طرف سے اس کا امین ہے۔ خدا کی راہ میں اس کے احکام اور قوانین کے مطابق اس امانت کو قربان کر دینا تو اس کا اخلاقی فرض ہے۔ کیونکہ خرید و فروخت کا جو معاملہ وہ پہلے کر چکا ہے اسی کا مقتضا یہی ہے کہ یہ متاع اب جس خریدار کی ملک ہے، اس کا منشا پورا کیا جائے۔ لیکن اگر خدا کے سوا کسی اور کے ہاتھ وہ اسے بیچتا ہے تو گویا فروخت کی ہوئی چیز کو پھر فروخت کرتا ہے جو کھلا ہوا جرم ہے اور اگر وہ خود اپنی مرضی سے اس کو کہیں ضائع کرتا ہے تو خیانت کا مجرم ہے۔ مسلمان نے جو سودا خدا کے ساتھ کیا ہے، اور جس سودے کی بنا پر ہی وہ مسلمان بنا ہے اُس کی

دُوسرے مسلمان کا فرض یہ ہے کہ جان دینے اور جان لینے کے معاملہ میں وہ خدا کے قانون کی پیروی کرے - اور خدا کا قانون یہ ہے کہ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ انسانی جان، جس کو اللہ نے حرام کیا ہے اس کو ہلاک نہ کرو مگر حق کی خاطر - اہلِ ایمان کی تعریف ہی قرآن میں یہ کی گئی ہے کہ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ - یعنی وہ کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے، حق کے سوا کسی اور وجہ سے ہلاک نہیں کرتے - ان دونوں آیتوں میں جان سے مراد ہر شخص کی اپنی جان بھی ہے اور دوسرے انسانوں کی جان بھی - یعنی مسلمان حق کے سوا کسی دوسری غرض کے لیے نہ اپنی جان دیگا اور نہ کسی کی جان لے گا۔

پھر حق کی تصریح قرآن یوں کرتا ہے:

قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۔ — ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور جنس دین (اطاعت و فرمانبرداری کی پوری جنس) اللہ کے لیے خاص ہو جائے۔

یعنی دنیا میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی و اطاعت ہونا اور کسی دوسرے کا قانون چلنا، یہ فتنہ ہے اور اس فتنہ کو فرو کرنا وہ حق ہے جس کی خاطر مسلمان کو نفسِ انسانی جیسی محترم چیز کے ضائع اور ہلاک کرنے کا ارتکاب کرنا چاہیے، کیونکہ دنیا میں فتنہ کا برپا ہونا قتل سے زیادہ بُرا ہے، وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔

اسی مطلب کو دوسری جگہ قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ — جو مومن ہیں وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں اور جو کافر

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ — ہیں وہ طاغوت کی راہ میں۔

یہ مسلمان اور کافر کے درمیان بنیادی اور اصولی فرق ہے۔ مسلمان کا کام اس لیے لڑنا ہے کہ خدا کا کلمہ بلند ہو، یعنی اس کا وہ قانون انسانی زندگی پر حکومت کرے جو اس نے انسانی معاملات میں عدل قائم کرنے کے لیے اپنے انبیاء کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ بخلاف اس کے کافروں کا کام یہ ہے کہ وہ طاغوت یعنی سرکشی، ظلم، زیادتی اور حدِ جائز سے تجاوز کرنے والوں کی اغراض کے لیے جنگ کریں۔

حدیث میں آیا ہے:

جاء رجل الی النبی صلعم فقال الرجل یقاتل للمغنم، والرجل یقاتل للذکر، والرجل یقاتل لیری مکانہ، فمن فی سبیل اللہ؟ قال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا کہ کوئی آدمی اس لیے لڑتا ہے کہ اسے مال ہاتھ آئے کوئی اس لیے لڑتا ہے کہ اس کی ناموری ہو۔ کوئی اس لیے لڑتا ہے کہ اس کو نمایاں مرتبہ حاصل ہو۔ ان میں سے کس کی جنگ فی سبیل اللہ ہے؟ فرمایا فی سبیل اللہ تو صرف اس کی جنگ ہے جو اس لیے لڑے کہ خدا ہی کا کلمہ بلند ہو۔

دوسری حدیث میں ہے:

جاء رجل الی النبی صلعم فقال یا رسول اللہ ما القتال فی سبیل اللہ فان احدنا یقاتل غضبا ویقاتل حمیۃ، فرفع الیہ راسہ فقال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ یا رسول اللہ! وہ کونسی لڑائی ہے جو اللہ کی راہ میں ہو؟ ہم میں سے کوئی تو جوشِ انتقام میں لڑتا ہے اور کوئی حمیتِ قومی کے جذبے سے۔ یہ سن کر آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا جس نے جنگ اس لیے کی کہ اللہ ہی کا بول بالا ہو، بس اس کی جنگ راہِ خدا میں ہے۔

اس کے برعکس جو شخص انسانوں کا بول بالا کرنے کے لیے لڑے، اور اس لیے جنگ کرے کہ کچھ انسان دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں اپنی اغراض کامیابی کے ساتھ پوری کریں، اس کے حق میں رسول خدا کا ارشاد ہے:

یجئ الرجل آخذا بید الرجل فیقول ان ھذا قتلنی فیقول اللہ لم قتلتہ فیقول لتکون العزۃ لفلان فیقول انھا لیست لفلان فیبوء

قیامت کے روز ایک آدمی دوسرے آدمی کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئیگا اور خدا سے عرض کریگا کہ اس نے مجھے قتل کیا تھا۔ خدا پوچھے گا تو نے اسے کیوں قتل کیا؟ وہ کہے گا اس لیے کہ فلاں کی عزت اور برتری قائم ہو۔ خدا

باشمہ۔ جواب دیگا کہ عزت اور برتری اس فلاں کا حق تو نہ تھی۔ پھر
اس مقتول کے گناہوں کا بوجھ اس قاتل پر لاد دیا جائیگا۔

یہ ساری تعلیمات صاف اور واضح ہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سب فتنہ ہے۔ مسلمان اگر لڑ سکتا ہے تو اس فتنہ کو بحیثیت مجموعی مٹا دینے اور اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے لڑ سکتا ہے۔ رہا یہ کہ وہ خود فتنہ و فساد میں کسی طرف سے حصہ لے اور کفر کے جھنڈے تلے کفر کا بول بالا کرنے کے لیے جنگ کرے تو یہ کام مسلمان ہوتے ہوئے وہ نہیں کر سکتا۔ جس کو یہ حرکت کرنی ہو وہ بہتر ہے کہ مسلمان کے نام کو بٹہ لگانے کے بجائے کھلم کھلا انہی میں جا ملے جن کا وہ بول بالا کرنا چاہتا ہے۔

مُسلم معاشرہ کو تہذیبِ جدید کا چیلنج

(عبدالوہاب عزام)

تہذیب جدید کا مقدمۃ الجیش اپنے جلو میں علوم و فنون اور فلسفہ لیے ہوئے آج سے تین سو سال قبل دنیا کے افق پر نمودار ہوا۔ اس کے نقوش برابر اُبھرتے رہے اور اس کے خط و خال ہر لمحہ نمایاں ہوتے گئے حتیٰ کہ آخری سو برس میں یہ تہذیب اپنے پورے شباب پر آ گئی۔

یہ تہذیب اس دنیا میں اس طرح پھیلی کہ بعض طبیعتوں نے اسے خود آگے بڑھ کر قبول کیا اور بعض کو اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ جب اہلِ مشرق کا اہلِ مغرب کے ساتھ میل جول بڑھا تو بعض اسلامی ممالک نے بطیبِ خاطر اس تہذیب کو اپنا لیا۔ لیکن بعض پر اسے بالجبر ٹھونسا گیا۔ مسلمانوں نے جب اس تمدن کے علمبرداروں کا اپنے ہاں اثر و نفوذ بڑھتے دیکھا تو اُن پر ایک قسم کا خوف طاری ہو گیا۔ انھوں نے یوں محسوس کیا کہ جیسے نظریات و افکار کا ایک سیلِ بے پناہ اُن کی طرف اُمڈا آ رہا ہے۔ اس سیلاب کے کئی ادوار ہیں مگر اُن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

مسلمانوں کو اس نئی تہذیب میں قوت و طاقت، علم و فن اور صنعت و حرفت نظر آئی۔ انھوں نے دیکھا اس میں ایک نظم اور ایک ضبط ہے۔ اس میں عیش و طرب کے سامان ہیں، اور یہ تہذیب حسّی لذات کے مختلف طریقوں کی نشاندہی کرتی ہے۔

مسلم قوم نے اس میں ایک ایسا نظریۂ حیات پایا جو اُن کے دین کے سراسر مخالف تھا اور اس نظریہ کی علمبردار وہ قومیں تھیں جن کے ساتھ ملتِ اسلامیہ صدیوں سے برسرِ پیکار چلی آ رہی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ اس نئی تہذیب کے پرستار مسلمانوں میں نفوذ کرتے جا رہے ہیں اور اپنے اس مسلک کی اشاعت کے لیے مختلف قسم کے دلآویز طریقے اختیار کر رہے ہیں۔

مسلمان حیران و ششدر تھے کہ وہ اس تہذیب کی یلغار کا مقابلہ کس طرح کریں۔ اُن میں اکثر ایک

مخمصے میں پڑ گئے۔ اُن کے اندر زبردست اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور اسی اختلاف کی بنا پر وہ تین گروہوں میں بٹ گئے۔

(۱) ایک گروہ کے سامنے ان اصحابِ تمدن کی عداوت، ان کا تسلط، ان کی قہرمانیت اور ان کا ظلم و عدوان تھا۔ جو تصورات و معتقدات اور افکار و اعمال وہ اپنے ساتھ لائے تھے وہ واقعتہً یا اس گروہ کی دانست میں دینِ حق کے مخالف تھے، اس گروہ نے غم و افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ دیکھا کہ اُن کا دین، ان کا اخلاق، اُن کا طرزِ معاشرت معرضِ خطر میں ہے۔ اس بنا پر یہ گروہ یورپ کی لائی تہذیب سے یکسر متنفر ہو گیا۔ خود اس سے اجتناب کیا اور لوگوں کو بھی اس سے بچنے کی تلقین کی۔

(۲) ایک دوسرے گروہ کی نظر صرف اس قوت و طاقت، علم و فن، صنعت و حرفت، اُس سیاسی و اجتماعی نظام، اُس اقتصادی خوشحالی اور سامان لہو و لعب پر تھی جو یورپ اسلامی ممالک میں لایا تھا۔ اس گروہ نے دیکھا کہ مغربی تہذیب نے اُسے بہت سے اخلاقی اور مذہبی قیود سے آزاد کر دیا ہے۔ یہ لوگ اس تمدن کے سامنے نقدِ دل و جان ہار بیٹھے اور اس پر اس حد تک فریفتہ ہوئے کہ انھوں نے اپنے آپ کو بھی یکسر فراموش کر دیا۔ ہر وہ چیز اُن کی نظر میں حقیر اور بے وقعت ہو کر رہ گئی جو انھیں اپنی تہذیب کی صورت میں ورثہ میں ملی تھی۔ وہ یورپین تمدن میں بالکل فنا ہو کر رہ گئے۔ ہر وہ چیز جو یورپ سے آئی وہ ان کے نزدیک سراپا خیر تھی اور ہر وہ بات جسے یورپ کی تائید حاصل نہ ہو سکی وہ انھیں سراسر برائی نظر آنے لگی۔ وہ یہ خیال کرنے لگے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس کی ہم حفاظت کریں۔ خوب و ناخوب کا معیار انھوں نے یورپ کو قرار دیا۔ اگر یورپ ہماری کسی بات کو پسند کرتا تو وہ بھی اُسی کی اتباع میں اسے سراہنے لگتے۔ مثلاً عربی گلکاری اہلِ یورپ کو پسند آئی اور انھوں نے اپنے گھروں کی اس سے زیبائش کی اور اُسے ارابسک (عرب کی گلکاری) کے نام سے موسوم کیا۔ انھیں کی تقلید میں مشرقی اقوام، جن میں عرب بھی شامل ہیں، اس کی مدح و ستائش کرنے لگیں۔ اگر اس گلکاری کا وہی عربی نام رہتا اور اہلِ مغرب کی نگاہ سے یہ اوجھل رہتی تو اہلِ مشرق بھی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے اور نہ ہی اس سے اپنے گھروں کی آرائش کرتے۔

یورپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے مشرقی قوموں کو اپنے سامنے اور بھی سرنگوں کیا۔ انسانی فطرت کا

یہ خاصہ ہے کہ کمزور طبائع ہمیشہ طاقتور کی تقلید کرتی ہیں۔ اجتماعیات کا یہ ایک مسلم اصول ہے کہ محکوم قومیں حاکم قوم کی پیروی کرتی ہیں۔

(۲) مسلمانوں کے ایک متوازن ذہن رکھنے والے اعتدال پسند گروہ نے اس معاملہ میں پورا غور و فکر کر کے اس تہذیب کو دو حصوں میں منقسم کیا۔ صنعتی تہذیب اور اخلاقی تہذیب اول الذکر کا انحصار قوانین طبیعی پر ہے جن پر مشرق و مغرب، مسلم و غیر مسلم سب متفق ہیں۔ اور جن کے بارے میں اُن کے ہاں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اس حصے میں طب، انجینیری اور مشین سازی شامل ہیں۔ ان علوم کا اکتساب ہمیں یورپ سے ہی کرنا چاہیے بلکہ مسلمانوں کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ وہ ان کے حصول، اور اُن سے عملی فائدہ اٹھانے میں پوری پوری جدوجہد کریں۔ عقل اس حقیقت پر شاہد ہے کہ مغرب اس میدان میں ہم پر سبقت لے گیا ہے اور اُس نے سائنس کی دنیا میں محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ وہ ان علوم کے اساتذہ ہیں۔ اس لیے ان سے علوم کے سیکھنے میں ہمیں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے[1]۔

---

[1] اس ضمن میں سب سے بنیادی اور اہم بات یہ ذہن نشین رہے کہ کسی تہذیب کے علوم و فنون کو اس تہذیب کی روح سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تسخیر کائنات کے یہ مظاہر درحقیقت کسی تمدن کے رُخ زیبا کے مختلف عکس ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن کبھی بھی خلا میں کام نہیں کرتا۔ وہ اپنی تحقیق و جستجو کا آغاز ہمیشہ ایک عملی مفروضے سے کرتا ہے اور یہی چیز اُس کے نتائج میں بنیاد کا کام دیتی ہے۔ اُس کے ہر کام میں اُس کا بنیادی نقطۂ نظر اپنا عکس ڈالتا ہے۔ اُس کا ذہن انفعالی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ شعوری طور پر مختلف عناصر و اجزا کے امتزاج سے فطرت کا ایک مخصوص تصور قائم کرتا ہے اور اس بنا پر نہ صرف معاشرتی علوم میں بھی، بلکہ خالص وہ حقائق جن کا تعلق عالم طبیعی سے ہے، اُن میں بھی وہ ایک خاص نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے وہ تجرباتی علوم جن کا بظاہر مغرب کے فلسفۂ حیات سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا ان کے قبول کرنے میں بھی مسلم قوم کو بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ آپ مثال کے طور پر علم طبیعی کو ہی لیں۔ بادی النظر میں اس علم کا مقصد کائنات کے مختلف مظاہر کے اندر ایک یکسانیت تلاش کر کے کچھ اصول و ضوابط وضع کرنا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ علم ایک مسلمان کے لیے

اس تہذیب کا دوسرا پہلو اخلاقی ہے۔ اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو اسے انسانی تہذیب کا نام دیجیے

۴۔بھی وہی حیثیت رکھتا ہے جو اس کی ایک غیر مسلم کے لیے ہے۔ مگر دیکھیے دونوں کے تصوراتِ حیات کے اختلاف کی وجہ سے اس میں کتنا وسیع اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ مسلمانوں نے جب انفس و آفاق پر غور کیا تو انھیں اس کائنات کے اندر ایک تدبّر، ایک تنظیم نظر آئی اور اس سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ کارخانۂ قدرت محض اتفاقی طور پر معرضِ وجود میں نہیں آگیا۔ اس کے پیچھے ایک خالق و مالک کی تدبیر کام کر رہی ہے۔ لیکن اسی کائنات کا جب ایک خدا ناشناس ذہن نے مطالعہ کیا تو اُسے یہ سب کچھ فطرت کی اندھی بہری قوتوں کی کرشمہ سازی نظر آئی۔ اس مثال میں آپ دیکھیں کہ مظاہر قدرت گو ایک ہیں لیکن دونوں کے نقطۂ نگاہ کے فرق کی وجہ سے دونوں نے ان سے بالکل مختلف اور متضاد نتائج اخذ کیے ہیں۔ یہی حال علم کیمیا، علم حیاتیات، علم نباتات اور علم نجوم کا ہے۔

فکر و نظر کے یہ اثرات صرف علوم پر ہی مرتب نہیں ہوتے بلکہ فنون بھی ان سے نہایت گہرے طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں یہ موقع نہیں کہ اس حقیقت کو کسی تفصیل سے سمجھایا جا سکے، لیکن اس کی وضاحت کے لیے میں صرف ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ "طب و جراحت" ایک ایسا فن ہے جس کے پیش نظر صرف انسانی فلاح ہے۔ لیکن اس فن نے جس تہذیب سے غذا حاصل کی ہے اور جس تمدن کی گود میں یہ پل کر جوان ہوا ہے، اُس کی روح اس کے اندر پوری طرح جاری و ساری ہے۔ چنانچہ یہ دیکھیے کہ اس فن نے جس قسم کے افراد تیار کیے ہیں، اُن کا منتہائے مقصود کیا ہے اور ان سے انسانیت کو کس قسم کے فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ پھر ان کی ادویات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے بنانے میں اس مقصد کو ہمیشہ ذہن میں رکھا جاتا ہے کہ وہ کچھ دیر استعمال کرنے سے انسان کی فطرتِ ثانیہ بن جائیں اور پھر انسان اُن کو زندگی بھر خریدنے پر مجبور رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی تہذیب و تمدن کے بطن سے جب مختلف علوم و فنون جنم لیتے ہیں تو ان میں اس تہذیب کا بنیادی تصور خون کی طرح دوڑتا ہے۔ وہ ان میں اس طرح سمویا ہوا ہوتا ہے کہ اُسے کسی طرح بھی ہم ان سے جُدا نہیں کر سکتے۔ معاملہ پھر یہیں تک ختم نہیں ہوتا بلکہ خود ان علوم و فنون کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ انھیں علم کیمیا کی طرح سادہ اجزا میں تحلیل کر کے، ان کے مضرت رساں اجزا کو

تہذیب کے اس حصہ کی صورت گری تاریخ، دین، اخلاق اور آداب سے ہوتی ہے۔ اہلِ مغرب کے نزدیک ۴۔ نفع بخش اجزاء سے الگ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب ناممکن ہے۔

صدیوں کے انحطاط کی وجہ سے مسلمانوں میں یہ احساس اب پوری طرح پرورش پا چکا ہے کہ یہ جدید علوم و فنون جن میں اہلِ مغرب نے کمال حاصل کیا ہے وہ صرف انہیں کی سعی و جہد کا نتیجہ ہیں مگر اصل صورت حال یہ نہیں جو بظاہر ہمیں نظر آتی ہے۔ دنیا کی جب کوئی قوم کسی نظریہ کو اپنا کر اُسے زمان و مکان کے لوح پر ثبت کرنے کا عزم صمیم کر لیتی ہے تو پھر وہ مجبور بھی ہوتی ہے اور اُس کے دل میں یہ فطری امنگ بھی اُبھرتی ہے کہ وہ اُن تمام موانع کو دُور کرے جو اس کی راہ میں حائل ہیں اور اُن سارے وسائل کو کام میں لائے جو اس مقصد کے حصول کے لیے اس کے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے وہ بعض قوموں کے ساتھ صلح کرتی ہے بعض کے ساتھ برسرِ پیکار ہوتی ہے۔ اسی طرح فطرت کو مسخر کر کے اپنے راستے سے قدرتی موانع ہٹاتی ہے اور پھر انہیں کی مدد سے وہ اپنے نصب العین کو غالب کرنے کے لیے سر توڑ کوشش کرتی ہے۔ یہ علوم و فنون بذاتِ خود کسی قوم کا مقصد نہیں ہوتے بلکہ مقصد کے حصول کا مؤثر ذریعہ ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی بھی جب تک اپنے دین سے وابستگی رہی اور اُس کو سربلند کرنے کا جذبہ اُن کو سرگرمِ عمل کرتا رہا انھوں نے بھی ان علوم و فنون میں محیر العقول ترقی کی۔ اب بھی اگر مسلمان اپنے نصب العین کو اپنا لیں تو یہ علوم و فنون خود بخود اُن کے ہاں پھیلنے شروع ہو جائیں گے۔ دین کو اپنائے بغیر اُن کا حاصل کرنا ایک نادان بچے کے ہاتھ میں تلوار دینے کے مترادف ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر کوئی ایسی قوم جو اپنا ایک مستقل نظریۂ حیات اور تہذیب رکھتی ہو۔ اس کے لیے کسی دوسری تہذیب سے بعض چیزوں کا بغیر ان کی روح کی تبدیلی کے اپنا لینا ہمیشہ مہلک ثابت ہوا ہے۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے ایک مشہور مغربی مفکر نے لکھا ہے:

"ہر تہذیب اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ اس کے آرٹ، اس کے مذہبی احساسات، اُس کے اندازِ زیست، اُس کے معاشی و صنعتی کمالات کے درمیان ایک فطری ربط پایا جاتا ہے۔ مجھے اس امر میں شک ہے کہ ایک تہذیب کسی دوسری تہذیب سے کچھ اخذ کر سکتی ہے۔ مثلاً کیا اہلِ مشرق یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مغرب سے جتنی چاہیں، اُس کی صنعتیں اور کارخانے، اس کا ""

اس میں کچھ خوبیاں اور کچھ برائیاں بھی ہیں، اس میں ہدایت کے ساتھ گمراہی ہے ۔اس کی اچھائی میں بہت سے عناصر شر کے بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اور اس کے محاسن کو بہت سی قباحتوں نے بگاڑ دیا ہے اس تہذیب کو صنعتی تہذیب پر قیاس نہیں کرنا چاہیے اور ہمارے لیے کسی طرح بھی جائز نہیں کہ ہم اس حصے کو اخذ کریں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی راہ زیادہ سیدھی اور صاف ہے اور اُن کا طریقہ زیادہ صحیح اور بہتر ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ ہم رشد و ہدایت کے معاملہ میں مغرب کی پیروی کریں بلکہ ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنی قیمتی میراث کی پوری قوت اور طاقت سے حفاظت کریں، اسے اپنے سینے سے لگائیں اور اُن اقدارِ حیات کی قدر و قیمت پہچانیں، جو ہمیں اس کے ذریعہ ملی ہیں۔

یہ اعتدال پسند گروہ اپنے مسلمان بھائیوں سے کہتا ہے : دیکھنا کہیں اس تہذیب کی ظاہری آب و تاب تمھیں مرعوب نہ کر دے، اُس کا مکر و فریب تمھیں دھوکا نہ دے دے، اس کی حسی لذات کہیں تمھیں مفتون نہ کر لیں، اس کا بھڑکیلا پن کہیں تمھاری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے اور اس کی گھن گرج کہیں میں جادۂ مستقیم سے بھٹکا نہ دے۔ تم یہ گمان نہ کرو کہ جس نے علم و فن میں ترقی کی ہے، جس نے زیادہ مال و اسباب جمع کیا ہے وہ افکار و معتقدات، سیرت و کردار اور اخلاق و آداب کے لحاظ سے بھی افضل ہے اپنی قدر پہچانو، اور اُن اخلاقی محاسن اور انسانی خصائل کی قدر کرنا سیکھو، جن کے تم وارث ہو۔

---

۴۲ علمِ طب تو وہ درآمد کریں گے مگر ہم وہاں کے معاشرتی انتشار، سرعت اور قنوطیت اور اسی طرح کی دوسری قباحتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔ اسی طرح مجھے اس بات کے ماننے میں بھی تردد ہے کہ اہلِ مغرب کبھی پوری ہوشمندی سے یہ کہہ سکتے ہیں "ہم مشرق سے اس کی مذہبیت کو لے لیں گے مگر ہم اپنے مادی علوم و فنون کو اس پر ہمیشہ فائق رکھیں گے۔

(ترجمان القرآن)

پھر یہ متوازن ذہن رکھنے والا طبقہ مسلمانوں کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے ان سے پورے زور کے ساتھ یہ کہتا ہے: مسلمانوں نے سیاسی آزادی کے حصول کے لیے پوری پوری کوشش کی ہے مگر اس سے زیادہ اہم اور اثرات کے اعتبار سے زیادہ دُور رس وہ جدوجہد ہے جو انھیں ذہنی غلامی سے نجات دلانے کے لیے کرنی چاہیے۔ تمھیں اپنی صلاحیتوں کو جانچنا اور اپنی عقل و فکر کی قوتوں کو اُجاگر کرنا چاہیے تاکہ وہ اس قابل ہوں کہ اس تہذیب کی خوبیوں کو اختیار اور اس کی مضرتوں کو ترک کر سکیں، تاکہ وہ خبیث و طیب کے درمیان امتیاز کر سکیں، تاکہ وہ ایک آزاد، مختار، صائب الرائے انسان کی طرح کھرے اور کھوٹے کے درمیان حدِ فاصل کھینچ سکیں۔ اس انسان کی طرح جو حلال و حرام کے درمیان اپنی عقل اور علم سے تمیز کرتا ہے۔ وہ غیروں کی عقل اور غیروں کے علم سے یہ کام سرانجام نہیں دیتا۔

ہمیں اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں کہ اس تہذیبِ جدید میں علمی اور صنعتی اعتبار سے انسانیت کو کئی ایک فوائد[1] بھی حاصل ہوئے۔ ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ علمی اور صنعتی کمالات کے علاوہ سیاسی اور اجتماعی امور میں بھی اس میں کئی پہلو خیر کے بھی ہیں لیکن یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اس کی مضرتیں بہت زیادہ ہیں اور اس نے انسانیت کے اندر ایک عظیم فساد اور اختلال پیدا کیا ہے۔ اس تہذیب نے ثابت کر دیا ہے کہ صنعتی اور علمی ترقی اخلاقی نشوونما

---

[1] یہ بات بھی محلِ نظر ہے کہ کیا واقعی نئی تہذیب علمی اور صنعتی اعتبار سے انسانیت کے لیے فائدہ بخش ثابت ہوئی ہے۔ جب ہم بڑے بڑے کارخانوں، رواں دواں کاروں اور عظیم الشان محلات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں احساس گزرتا ہے کہ شاید انسانیت نے ترقی کی ہے۔ لیکن جب ہم اُس تباہی پر غور کرتے ہیں جو پہلی اور دوسری عالمگیر جنگیں انسانیت پر لا چکی ہیں، جب ہم فراوانی کے اس دور میں انسان کی بدحالی پر نگاہ ڈالتے ہیں، جب ہم اُس انتشار کا تصور کرتے ہیں جس سے انسانیت اس وقت دوچار ہے تو ہم پھر ایک گہری سوچ میں پڑ جاتے ہیں اور موازنہ کرنے لگتے ہیں کہ انسانیت نے اس تہذیب میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ اس تہذیب کا سب سے افسوسناک پہلو یہی ہے کہ جس انسانیت کے لیے یہ علمی اور صنعتی ترقی کی گئی ہے اُس انسانیت کو ہی اس تہذیب کے اعیان نے داؤں پر لگا دیا ہے۔ (ترجمان القرآن)

کی ضامن نہیں ہو سکتیں۔

ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ اس تہذیب میں شر نے خیر کے ساتھ مل کر اُس کو بھی شر بنا دیا ہے، اس کی برائیوں نے اس کی خوبیوں اور اچھائیوں کو بھی مسخ کر دیا ہے، اس کے آلام و مصائب نے اس کی راحتوں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ ہم حسرت بھری نگاہوں سے یہ دیکھتے ہیں کہ اس تہذیب کا دل و دماغ ایک دوسرے کے ہم رکاب نہیں۔ اس میں ایمان و ایقان، خیالات و افکار کی حفاظت اور پاسبانی نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے ایک مستقل بے چینی اور دائمی اضطراب ہے۔ جو اس آیۂ کریمہ کا مصداق ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ وَيَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ۔

کہہ دو کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ تمھارے اوپر سے یا تمھارے پیروں تلے سے کوئی عذاب لا کھڑا کر دے یا تمھاری جماعت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمھیں ایک دوسرے سے لڑا دے اور اس طرح تمھیں ایک دوسرے کے ہاتھوں جنگ کا مزہ چکھا دے۔

اس وقت ہمارا یہ مقصد نہیں کہ ہم تہذیبِ حاضر کے محاسن گنوائیں اور اس بات کا جائزہ لیں کہ نوعِ انسانی کو اس تہذیب و تمدن سے کیا کیا فوائد حاصل ہوئے۔ ہم یہاں اپنی بحث کو صرف اسی حد تک محدود رکھتے ہیں جہاں تک ملتِ اسلامیہ کو اس تہذیب کے افکار و نظریات سے خطرہ لاحق ہے۔ اس کے بیان میں بھی ہم اختصار سے کام لیتے ہیں اور صرف ضروری اور اہم امور کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔

اس بدیہی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تہذیبِ نو پر الحاد و مادیت پوری طرح مسلط ہے اور اس کا تانا بانا حسی لذات کے دلفریب تاروں سے تیار کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس تہذیب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس پر الحاد اور زندقہ چھایا ہوا ہے اور مادیت غالب ہے۔ ملتِ اسلامیہ بحیثیت ایک جماعت کے دین کی حامل ہے، اُس کا خدا پر ایمان و ایقان ہے اور اسی

کی محبت سے اُس کا دل سرشار ہے۔ اُس کی رضا جوئی اُس کی زندگی کی غایت الغایات ہے، وہی اس کا مبتدا اور منتہا ہے۔ اُس کے افکار و اعمال، نظریات و معتقدات سب اسی ایک محور پر گھومتے ہیں۔ اسی کا عطا کردہ ایک ضابطۂ حیات ہے جس نے مسلمانوں کو ایک منظم جماعت بنا دیا ہے؛ جس نے اُن کے مختلف داعیات اور رجحانات کے مابین ایک وحدت اور ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ ایک شرعی نظام ان کی شیرازہ بندی کرتا ہے، اور ایک ایسا ایمان اُن کی پشت پناہی کرتا ہے جو زمان و مکان یا احوال و ظروف کی حد بندیوں سے بلند و بالا ہے۔

> نفس تنہا تو بھٹکے ہوئے میلانات رکھتا ہے جن کی کوئی حد نہیں ہے۔ لیکن یہی نفس اگر حق سے وابستہ ہو جائے تو شریعت کے نظام کو قبول کر لیتا ہے، اور یہی نفس حبیب حق تعالیٰ سے تعلق پیدا کرے، تو علم اور دوام حاصل کرتا ہے[1]۔

مومن کی شان ایک مومن و مسلم خدا پر پختہ ایمان رکھتا ہے، اور بلا واسطہ اس سے رابطہ پیدا کرتا ہے۔ اُسی کی رضا اُس کے نزدیک زندگی کی منزلِ مقصود ہے۔ اور وہ ہر لمحہ اس امر کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ اپنے آپ کو صفاتِ الٰہی سے متصف کرے۔ مادی دنیا اُس کے نزدیک بالکل حقیر اور بے وزن ہے۔ وہ اس سے بلا شبہ فائدہ اٹھانے کے جد و جہد کرتا ہے، مگر اسی کو منتہائے مقصود خیال نہیں کرتا۔ وہ اپنی تگ و تاز میں مادی دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہے اور اُس روحانی دنیا کی تلاش کرتا ہے جو بے پایاں و بے کنار ہے۔ اُس کے عقائد و نظریات نہ تو حسی دنیا تک محدود رہتے ہیں اور نہ ہی یہ مادی دنیا اُن کے لیے بنیادیں فراہم کرتی ہے۔ وہ دنیا کا آقا ہوتا ہے اور اس کا محکوم بن کر نہیں رہتا۔ دنیا اس کی گرفت میں ہوتی ہے، مگر اُس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہیں ہوتی۔ وہ متاعِ دنیا سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے، لیکن نہ تو اس سے مرعوب ہوتا ہے اور نہ ہی مغلوب۔ وہ اس کی محبت میں اپنے آپ کو گرفتار نہیں کرتا بلکہ اُس کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنا تا ہے اور اپنی اخلاقی برتری اور دینی قوت کے سہارے انہیں مسخر کرتا ہے۔ وہ اُس سے صرف اسی قدر استفادہ کرتا ہے جتنا کہ دین اور اخلاق اُسے اجازت دیتے ہیں۔ وہ ایک ضابطۂ قانون کے مطابق اس میں جد و جہد

[1] دیوان الشافی

کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ صراطِ مستقیم پر گامزن رہتا ہے۔ اس کا دستورِ حیات یہ نہیں کہ جس چیز کو چاہا، حق قرار دے دیا اور جس کو چاہا باطل ٹھہرا دیا، بلکہ اُس کا طرزِ عمل یہ ہے کہ جسے شریعت نے حلال کہا ہے وہ اُس کے نزدیک حلال ہے، اور جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے وہ اس کی نگاہ میں حرام ہے۔ جو کام انسانی عز و شرف کے شایانِ شان ہیں وہ جائز اور جو اس کے خلاف ہیں وہ اس کے نزدیک ناجائز ہیں۔

وہ اس سرزمین میں اپنے آپ کو خدا کا نائب اور خلیفہ سمجھتا ہے جس کا مقصدِ وحید اس کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنا ہے۔ وہ خدا کی سرزمین کو نہ صرف آباد کرتا ہے بلکہ اس میں اصلاح بھی کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ حق پر قائم رہتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں بڑا ہمدرد اور ایثار کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ راہِ حق کا سپاہی ہے اور خیر اور بھلائی کی طرف اس جذب و شوق، اشتیاق اور ولولہ سے دعوت دیتا ہے جیسے کہ پوری انسانیت کے متعلق صرف اُسی سے بازپرس ہونے والی ہے۔ وہ دنیا اور اُس کے متعلقات سے بے تعلق، برائیوں سے اجتناب کرنے والا، اور برائیوں کے خلاف سرکش ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ وہ بڑا ہی کریم النفس اور شفیق بھی ہے۔ تعلق باللہ اُس میں قوت و طاقت پیدا کرتا ہے، اُسے ہر چیز سے بے نیاز بنا دیتا ہے اور اُس پر کبھی مایوسی طاری نہیں ہوتی۔ رحمتِ باری سے گم کردہ راہ کے علاوہ اور کون مایوس ہو سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ سرگرمِ عمل رہتا ہے۔ ناکام ہونے کے باوجود کامیابی کی کوشش میں ہمت آزما رہتا ہے۔ اس کے پائے ثبات میں کبھی تزلزل نہیں آتا۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ ہر سختی کے بعد راحت ضرور آتی ہے اور ہر تنگی کے بعد کشائش بالیقین ظاہر ہو کر رہے گی۔ دنیاوی مصائب و آلام اگر اُس پر یکبارگی یلغار کر دیں تو وہ اپنے آپ کو ہلاک نہیں کرتا۔ اس کا ایمان دنیا کی مسرتوں اور دکھوں سے بالاتر ہے۔ اُس کا نفس دنیا اور اُس کے تلخ و شیریں تجربات سے اعلیٰ اور ارفع ہے اور اُس کی ہمت اس کے رنج و راحت سے بالکل متاثر نہیں ہوتی۔

اُمتِ مسلمہ جو ایمان کی ان بنیادوں پر قائم ہے ان صفات سے متصف ہے، وہ جب یہ دیکھتی ہے کہ اُس کے ہر فرد پر اس تہذیبِ الحاد اور حسی تمدن کے اثرات بڑھتے جا رہے ہیں تو وہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ وہ اس تہذیب کی آغوش میں پل کر جوان ہونے والے افراد کو خود غرض اور دنیاوی فوائد و لذائذ کا غلام

پاتی ہے۔ وہ یہ دیکھتی ہے کہ ان لوگوں کے سارے افکار و نظریات، احساسات و رجحانات اسی عالمِ مادّی کے خمیر سے تیار کیے گئے ہیں اس لیے اس تہذیب کے پرستار نے اس سے آگے نہ کبھی کچھ دیکھا اور سوچا ہے، اور نہ ہی اس سلسلہ میں کوئی ایسی کوشش کی ہے۔ اسی کی سعی و جہد کا ہدف صرف مادّی فوائد کا حصول ہے۔ اور وہ جب اس مقصد تک پہنچنے کے لیے راہیں مسدود پاتا ہے تو پھر جائز ناجائز، حلال و حرام، خبیث و طیب کے سارے امتیازات یک قلم ختم کر کے آگے بڑھتا ہے لیکن اگر اس میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے، تو جان تک کو بھی ختم کرنے سے گریز نہیں کرتا کیونکہ اس کی زندگی سراسر مادّی ہے، اور جب اُسے مادّی آسائش اور لذّتیں حاصل نہ ہوں تو آخر اس زندگی کا کیا فائدہ؟

زر و مال اس کا کعبۂ مقصود ہے، جس کے کمانے اور جمع کرنے میں وہ ہر خست و رذالت کو گوارا کر لیتا ہے۔ یہ قحبہ خانے، یہ عیاشی اور بدکاری کے اڈے، جو دن رات آباد رہتے ہیں اور انسانوں کو منکرات پر اُبھارتے ہیں۔ جن کے ذریعے اہلِ مغرب شہوانی فوائد و لذائذ حاصل کرتے ہیں —— یہ سب مال و شہوات کی پرستش کے مختلف مظاہر ہیں اور دین و اخلاق کی توہین کی مختلف صورتیں۔

مسلمان عورت مسلمان عورت گھر کی مالکہ، نیک بخت بیوی، شفیق ماں، پاک دامن خاتون، ہر قسم کی دنائت و ذلّت سے گریز کرنے والی ہے۔ اسلام اس کی عزت و ناموس کا محافظ اور اُس کے حقوق کا پاسبان ہے مگر اسلام اسے اپنی اور اپنے گھر کی دیکھ بھال کا ذمہ دار بھی ٹھہراتا ہے۔ مسلمان اس تہذیب جدید کے فتنوں سے خائف ہیں اور انہیں اس بات کا ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں یہ تمدن اُسے راہِ راست سے بھٹکا نہ دے۔ نئی تہذیب عورت کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر باہر لے آئی ہے، اُسے خاوند سے سرکشی پر آمادہ کیا ہے، اسے اولاد سے بیزار کیا ہے۔ اُس کی مصروفیت اب بازاروں، صنعت گاہوں، جلسوں اور محفلوں میں اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ گھر سے باہر ہی گزارتی ہے اور جب کبھی گھر میں داخل بھی ہوتی ہے تو ان مجالس میں شرکت کے لیے اپنی زیب و زینت میں لگی رہتی ہے۔ اُس نے اولاد کو کھو دیا ہے اور خاندانی روابط کو توڑ دیا ہے۔ اس تہذیبِ جدید نے عورت کو یہ سارے فریب حریّت اور مساوات کے نام پر دیئے ہیں۔ اور اس بیچاری

پر اُن صعوبتوں کو لاد دیا ہے جس کے لیئے وہ درحقیقت پیدا نہیں کی گئی اور نہ ہی وہ انھیں اٹھانے کی سکت رکھتی ہے۔ زمین و آسمان کا تفاوت ہے اُس عورت کی زندگی میں جو بازاروں میں ماری ماری پھرتی ہے، اور اُس عفیفہ میں جو گھر کی مالکہ ہے۔

تہذیب جدید چاہتی ہے کہ عورت راہ چلتے نظربازوں کے لیے اپنی ذات کے اندر سامانِ تسکین فراہم کرے اور وہ بازاری قسم کے لوگوں کی نگاہوں کا ہدف بنے۔ وہ لوگ اس کے جسم سے دن رات تجارت کرتے ہیں اور اسی کے دم قدم سے آج عشرت کدے اور قحبہ خانے آباد ہیں۔ یہ بیچاری اس تہذیب کے ہاتھوں ایک کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی حیثیت محض ایک نفع بخش کاروبار کی سی ہے۔

مسلمان اس بات کے آرزومند ہیں کہ عورت کی آبرو، اس کی عزت وناموس کی حفاظت کی جائے۔ وہ گھر میں رہ کر اپنے رفیقِ حیات کے لیے راحت، و آرام کا باعث بنے، اپنی اولاد کی اچھی تربیت کرے۔ مسلمان اس صنفِ نازک کو مغربی تہذیب کے لائے ہوئے مصائب سے بچانا چاہتے ہیں اور وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ وبا اُس کے ہاں پھیل کر اُس کو بھی تباہ نہ کردے۔

مسلمان خاندان | مسلمان خاندان ایثار و محبت، اطاعت و فرمانبرداری، نیکی اور حسنِ سلوک کے لطیف اور پاکیزہ احساسات سے تشکیل پاتا ہے۔ ہم آج تک کسی ایسے قانون، ضابطۂ حیات یا مذہب سے آشنا نہیں ہوئے جس نے والدین کے عزت و احترام کو وہ بلند مقام بخشا ہو، جو اسلام نے انھیں عطا کیا ہے۔ قرآنِ حکیم نے ان کا مرتبہ اتنا زیادہ بڑھا دیا ہے کہ اُن کے ساتھ نیکی اور اچھے برتاؤ کا ذکر خدا کی توحید اور عبادت کے ساتھ ساتھ کیا ہے[1]۔ اللہ تعالیٰ ہر حالت میں اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین

---

[1] وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ (البقرہ - ۱۰) یاد کرو جب ہم نے اسرائیل کی اولاد سے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا ماں باپ کے ساتھ، عزیز و اقارب کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور لوگوں سے بھلی بات کہنا۔

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ فیصلہ کر دیا تیرے رب نے کہ تم کسی کی عبادت نہ کرو

کرتا ہے۔ ہاں اگر وہ مشرک ہوں اور اپنے بچے کو شرک کا حکم دیں تو اس بارے میں اُن کی بات نہیں ماننی چاہیے لیکن اور معاملات میں اُن سے نہایت ادب سے پیش آنا چاہیے۔[۶]

اسلام نے ماں کی عزت و توقیر اور پاس و لحاظ کو باپ سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس لیے کہ ماں بچہ کو جنم دینے میں سخت دکھ جھیلتی ہے، اُسے دودھ پلاتی ہے۔ اپنی آغوش میں پالتی ہے اور اس پرورش میں بڑے مصائب برداشت کرتی ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے بتایا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اسلام نے قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کی بھی بڑی تاکید کی ہے اور اُن کے حقوق کو حقوق الٰہی کے

---

۴ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۔ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (بنی اسرائیل ۲)

مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچیں تو انہیں اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ اُن کے سامنے جھک کر رہو۔ اور دعا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

۵ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۔ (العنکبوت ۱)

اور ہم نے تاکید کی انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی لیکن اگر وہ تجھے شرک پر مجبور کریں جس کی تجھ کو خبر نہیں تو اُن کا کہا مت مانو۔

۶ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۔ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۔ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ (لقمٰن ۲)

اور ہم نے والدین کے بارے میں انسان کو تاکید کر دی۔ اس کی ماں نے تھک تھک کر اُسے پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اُس کا دودھ چھڑایا۔ حق مان میرا اور اپنے ماں باپ کا۔ آخر مجھی تک آنا ہے لیکن اگر وہ دونوں تجھے شرک پر مجبور کریں تو اُن کا کہا مت مانو مگر دنیا کے دستور کے مطابق اُن سے حسن سلوک کرو اور اس کی اتباع کر جس نے میری طرف رجوع کیا۔

ساتھ بیان فرمایا ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۔ جس خدا کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اس کا اور قرابت داروں کا پاس ملحوظ رکھو۔

مسلمان گھرانا ایک پاکیزہ گھرانا ہے۔ جس میں ایک دوسرے سے محبت اور باہمی تعاون بطور بنیاد کام دیتے ہیں، جس میں والدین کا احترام اور بھائیوں سے مروت ہوتی ہے چھوٹے بڑوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ تہذیب جدید کے لائے ہوئے افکار و نظریات اس عائلی نظام کے لیے ایک زبردست چیلنج ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ محبت و اخوت کے ان مقدس رشتوں کو توڑ کر اسلامی گھرانے کا شیرازہ بکھیر دیا جائے تاکہ بغاوت، سرکشی اور نافرمانی کی آندھیاں ان افراد کو پھر جہاں چاہیں اڑا کر لے جائیں۔ گھر بے آباد ہوں اور ان کی جگہ ساری رونق شرکوں، محفلوں ہوٹلوں اور کلبوں میں سمٹ جائے نہ والدین کا احتساب باقی رہے، نہ بزرگوں کا احترام اور نہ بچوں پر شفقت[1]

[1] صاحب مقالہ نے جس وقت نظر سے اس پریشان کن صورتِ حال کا مطالعہ کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ تہذیب جدید نے یوں تو زندگی کے سب شعبوں میں ایک زبردست بگاڑ پیدا کیا ہے لیکن اس نے جس طریقہ سے خاندانی نظام کو درہم برہم کیا ہے وہ حد درجہ تشویشناک ہے۔ اس کے زہریلے اثرات اب یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ خود اہلِ مغرب بھی چلا اٹھے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں سوسائٹی پر بہت سی کتابیں ایسی شائع ہوئی ہیں جن میں ان چیزوں کا رونا رویا گیا ہے۔ ہم ذیل میں صرف چند اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

"انسان محض حیاتیاتی وجود ہی نہیں رکھتا جس کا اپنا کوئی نظریہ نہ ہو، بلکہ وہ بہت سے ایسے احساسات و رجحانات رکھتا ہے جو صحیح نشو و نما کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس فرض کو ماضی میں خاندان سرانجام دیتا تھا۔ لیکن آج کل خاندان اس اہم فرض کی بجا آوری میں مجرمانہ غفلت برت رہا ہے۔ اس کوتاہی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایک ایسا خاندان جس میں خاوند اور بیوی کے تعلقات کسی مضبوط بنیاد پر استوار نہ ہوں وہاں بچوں کی صحیح طور پر تربیت نہیں ہو سکتی۔ جس کی وجہ سے بچوں میں اوصافِ حمیدہ پیدا ہونے کی بجائے بہت سی اخلاقی کمزوریاں ابھر آتی ہیں۔ ایسے خاندانوں میں پرورش پانے والے بچے بالعموم کم ظرف، تخریبی اور منافق ہوتے ہیں۔ اگر تعلیمی ادارے تربیت کی اس کمی کو کسی حد تک پورا کر سکتے م

میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی معاشرہ میں اس تہذیب کی وجہ سے بڑا اختلال اور فساد پیدا ہو گیا ہے ۔

۵- تو پھر بھی کوئی بڑی بات نہ تھی، مگر وہ ایسا نہیں کر سکے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ان پڑھ ماں جس میں ذہانت موجود ہو، وہ ان سکولوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کے مقابلہ میں بہتر معلمہ اخلاق ثابت ہو سکتی ہے ۔ اس کا اثر یہ ہے کہ اب مجرموں اور فساق و فجار کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے ۔ اب دنیا میں ایسے افراد پیدا ہو رہے ہیں جو نہ تو کسی مضبوط سیرت کے مالک ہیں اور نہ ہی انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے ۔" SOROKIN THE CRISIS OF OUR AGE

"موجودہ سماج نے سب سے زیادہ فاش غلطی یہ کی ہے کہ اس نے تربیت کے لیے خاندان کے مقابلہ میں مدرسوں پر اعتماد کیا ہے ۔ آج کی ماں اپنے بچے کو نرسری سکول میں صرف اس لیے چھوڑ آتی ہے تاکہ وہ اپنی معاش کے لیے آزاد شہوت رانی کے لیے فضول قسم کی آرٹ پرستی کے لیے اور برج کھیلنے یا سینما جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت بچا سکے اور اس طرح ایک قسم کی فضول بیکاری (BUSY IDLENESS) میں منہمک رہے ۔ اس طرز زندگی نے خاندانی نظام کو، جس کے زیر اثر رہ کر بچہ بہت کچھ سیکھتا تھا، بالکل درہم برہم کر دیا ہے ۔ ایک بچہ اپنی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کو ماحول کی مدد سے ہی صحیح طور پر نشو و نما دے سکتا ہے ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی حد تک الگ تھلگ بھی رہے مگر خاندان کے افراد کی توجہ کا مرکز بھی ہو ۔" (ALEXIS CARREL: MAN THE UNKNOWN)

"ایک ایسی سوسائٹی جو بنیادی طور پر صنعتی ہے اور جس کی تنظیم بڑی تیز رفتاری کے ساتھ خالص میکانکی خطوط پر کی جا رہی ہے، ایک فرد کا اپنے باپ کے ساتھ برتاؤ کوئی معاشرتی اہمیت نہیں رکھتا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں باپ کا اپنے بیٹے پر اقتدار ہر آن کم ہو رہا ہے ۔ اور اسی طرح بیٹے کے دل میں اپنے باپ کی طرف سے عزت و احترام کا جذبہ روبزوال ہے ۔ ان کے باہمی تعلقات تیزی کے ساتھ قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں اور عملاً ایک ایسی سوسائٹی کے ذریعہ ان تعلقات کا خون ہو رہا ہے جس میں افراد کے باہمی حقوق کے منسوخ کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے اور جس کا اثر یہ ہے کہ خاندانی رشتہ داری کے مقرر کیے ہوئے حقوق بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں ۔" (ISLAM AT THE CROSS-ROAD) ۴۴

اس میں اضطراب اور بے چینی کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ والدین کا وہ عزت و احترام، بھائیوں سے محبت اور تعاون، اور وہ اخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ، جو ماں کی آغوش میں اچھی تربیت پانے سے حاصل ہوتے ہیں، یکسر ناپید ہو گئے ہیں۔

مسلمان حق کے گواہ کی حیثیت سے | ملت اسلامیہ کا رفیع الشان قصر حق کی بنیاد پر اٹھایا گیا ہے۔ اس امت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ہر حال میں عدل و انصاف کی حفاظت و پاسبانی کرے اور اپنے اُس عہد و پیمان کو پوری طرح نبھائے جو اس نے کسی سے باندھا ہے۔ قرآن حکیم اسے نہایت واضح الفاظ میں حکم دیتا ہے کہ تم عدل کی راہ اختیار کرو۔ دیکھو تمہیں تمہاری خواہشات نفسانی کہیں راہ حق سے بھٹکا نہ دیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ۔

اے ایمان والو! خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ناانصافی پر نہ اکسائے۔ انصاف کرو کہ انصاف تقویٰ سے قریب ہے اور خدا کی نافرمانی سے بچو۔ خدا تمہارے اعمال سے یقیناً آگاہ ہے۔

۴۴ "ہم کھانا اب ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں کھاتے ہیں۔ ہماری روٹی بیکری سے آتی ہے۔ کپڑے لانڈری میں دُھلتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں راحت و آرام کیلئے لوگ خاندانوں کی طرف رجوع کرتے تھے لیکن اب اس کے لیے سینماؤں، تھیٹروں اور کلبوں کا رُخ کیا جاتا ہے۔ پہلے خاندان ہماری دلچسپی کا مرکز تھا اور خاندانی زندگی ہی میں سکون تلاش کیا جاتا۔ مگر اب خاندان کے افراد بکھر گئے ہیں اور اگر کچھ مل کر بھی رہتے ہیں تو اس کا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ وہ دن کا زیادہ وقت اکیلے فکر معاش میں بسر کرتے ہیں۔ رات کا وقت جس میں خاندان کے افراد اکٹھے ہوتے تھے وہ بھی اب علیحدگی میں گزرتا ہے۔ اب ہمارے گھر ہمارے لیے استراحت کی جگہ نہیں رہے جہاں ہم شب باش ہوں۔ شب باشی کا تو ذکر ہی کیا۔ اب تو ایک پوری رات بھی لوگ اپنے گھروں میں بسر کرنا پسند نہیں کرتے۔

(SOROKIN: THE CRISIS OF OUR AGE)

(مترجم)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۔	اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے جم جاؤ اور خدا لگتی گواہی دو۔ اگرچہ یہ گواہی تمہارے اپنے یا تمہارے ماں باپ اور قرابت داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

ایک مسلمان کو کسی کا حق مارنے اور کسی کا استخفاف کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اسی طرح اُسے اس بات کی بھی تلقین کی گئی ہے کہ وہ نہ تو افترا پردازی کرے اور نہ ہی کسی پر جھوٹا الزام لگائے۔ عورت پر اتہام باندھنے والے کو تو خاص سزا کا مستوجب ٹھہرایا گیا ہے۔ جو لوگ اس قسم کی حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں اُن کا کوئی اعتماد باقی نہیں رہتا اور ساری عمر کے لیے اُن کی گواہی ناقابلِ قبول ہو جاتی ہے۔ یہ تہمت طرازی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اُن کی ہوا و ہوس اُن کے دین و ایمان پر غالب ہے۔ وہ بغیر کسی دلیل کے نہایت سخت اور رسوا کن باتیں اپنے منہ سے نکال دیتے ہیں، لہٰذا وہ اس قابل ہیں کہ ان کے اقوال کی صداقت کو مشکوک سمجھا جائے اور ہر طرح کی شہادت میں اُن کی بات ساقط الاعتبار ٹھہرا دی جائے۔

تہذیبِ جدید اپنے ساتھ جو نئے افکار و تصورات لے کر آئی ہے اُن کی رُو سے جھوٹ اور افترا جیات انسانی کے بالکل معمولات بن گئے ہیں۔ اب انسان کے اُن اوصاف کی تحسین و توصیف کی جاتی ہے جن سے فی الواقع وہ متصف نہیں ہوتا اور ایسے کارناموں پر قصیدے پڑھے جاتے ہیں جو اُس نے کبھی سرانجام نہ دیئے ہوں۔ ایک ہی قوم میں اخبارات نے اپنے دھڑے کی ہر جائز و ناجائز حمایت کو اپنا فرضِ منصبی قرار دیا ہے۔ پھر معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ انہیں اخبارات نے مختلف اقوام کے درمیان پھوٹ اور عداوت کے بیج بونے کے لیے کذب و دروغ کے ایسے نوادر پیش کیے جن کی نظیر نہیں ملتی۔ ایک قوم دوسری پر بالکل بے بنیاد الزام لگاتی ہے اور پروپیگنڈے کا یہ سارا طوفان اس شدت سے اٹھایا جاتا ہے کہ حق و باطل میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ گمراہی کی شاید ہی کوئی شاہراہ اب ایسی ہے جس پر ترقی کے اس دور میں افراد و اقوام گامزن نہ ہوں۔ اگر کسی شخص کو میری ان معروضات کے بارے میں شک ہے تو براہ کرم اس پراپیگنڈہ کا جائزہ لے جو ریڈیو پر دن رات نشر ہوتا رہتا ہے۔ یہ واویلا جو دنیا میں آج ہر سو پھیلا ہوا ہے، یہ مختلف دعاوی، یہ متناقض خبریں اور یہ گمراہ کن نظریات سب اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ حق اور انصاف

کی اب اہلِ دنیا کی نظر میں کوئی اہمیت اور وقعت باقی نہیں رہی اور حکومتوں، جماعتوں اور پارٹیوں نے اپنے ذاتی مفاد کے حصول کے لیے ہر قسم کے جھوٹ اور افترا کو بالکل جائز ٹھہرا دیا ہے۔ انہی مفادات کی خاطر لوگ ایک دوسرے پر اتہام باندھتے ہیں اور اسی غلط پروپیگنڈے کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے خائف بھی ہیں ہر گروہ دعویٰ یہی کرتا ہے کہ وہ دنیا میں خیر اور بھلائی چاہتا ہے، وہ عدل و انصاف کا علمبردار ہے، مگر ان کے یہ سب بلند بانگ دعاوی محض مکر و فریب ہیں۔ اسی طرح ہر جماعت ڈھنڈورا پیٹتی ہے کہ وہ فتنہ و فساد نہیں چاہتی، وہ جنگ و جدال کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ لیکن اُس کا طرزِ عمل اُس کے اس دعوے کی تائید نہیں کرتا۔

یہ ہیں وہ برائیاں جو اسلامی معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنے کے درپے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے مسلمان انہیں مہذب اور متمدن اقوام کے قابلِ رشک طور طریقے سمجھ رہا ہے۔ وہ انہیں تہذیبِ جدید کے لازمی تقاضوں کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ مسلمانوں کی اس سے زیادہ شامتِ اعمال اور کیا ہوگی کہ وہ ان کے فریب میں آجائیں۔ اگر تہذیبِ جدید کے یہ شر انگیز کارنامے انہیں اپنے دام میں پھنسالیں، اگر اس کی گمراہیاں انہیں راہِ حق سے بھٹکادیں اور اگر اس کا شور شغب اُن کے کان بہرے کردے تو اس سے زیادہ قابلِ افسوس بات ایک مسلمان کے لیے اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

ایک مومن و مسلم کی زندگی کا تو اصل مقصد ہی یہی ہے کہ وہ اس دنیا میں حق و انصاف کا علمبردار بنے وہ نہ تو کسی پر ظلم اور زیادتی کرے اور نہ ہی ہوا و ہوس کی پیروی کرے۔ وہ جھوٹ اور مکر و فریب سے بچتا رہے یہی ایک مسلمان کی اصل خصوصیات اور صفات ہیں اور اسلام انہیں دنیا میں فروغ دینا چاہتا ہے۔ ایک مسلمان کا حقیقی مقصد یہی ہونا چاہیے۔ اس لیے وہ جس وقت بھی یہ محسوس کرے کہ ان میں کمی آرہی ہے تو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کرتا ہے۔ اسلام معاشرہ کی تعمیر محبت اور تعاون کی بنیادوں پر کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ ہر فرد شریعت کے مطابق رزقِ حلال حاصل کرسکے۔ اس میں اگر کوئی فرد امیر ہو تو اسے اس امر کا پوری طرح احساس ہو کہ وہ تنہا اس دولت کا مالک نہیں، بلکہ اس میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے جو غریب اور نادار ہیں۔ یہ دولت تو ڈھلتی

چھاؤں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ آج جو شخص فقیر و محتاج ہے وہ کل غنی اور مالدار ہو اور اس کے برعکس آج جو شخص دولت میں کھیلتا ہے وہ کل بالکل فاقہ مست اور قلاش بن جائے۔ اس بنا پر نہ تو اصحاب دولت و ثروت کو بخیل اور سنگ دل ہونا چاہیے اور نہ ہی غریب کو اپنے دل میں حسد و عداوت کے جذبات پالنے چاہئیں۔

شریعتِ اسلامی سب کی نگران ہے، وہ ہر شخص کے حقوق کی ضامن ہے اور ہر ایک پر ذمہ داریاں بھی عائد کرتی ہے۔ وہ امیروں سے مال لے کر اُسے اُن لوگوں تک پہنچاتی ہے جو اس سے محروم ہیں۔ اور اس طرح لوگوں کے درمیان اخوت و مودّت کے مقدّس رشتوں کو استوار کرتی ہے۔

اسلامی معاشرہ افراد کے مابین قرابت داری کے تعلقات کو مضبوط کرتا ہے۔ اس نے قرابت داروں کے حقوق کے معاملہ میں بڑی تاکید کی ہے اور صلۂ رحمی پر بڑا زور دیا ہے۔ پھر اسلام نے پڑوسیوں کے حقوق کی بھی نگہداشت کی ہے اور ہم پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ ہم اُن کی عزت و ناموس کی حفاظت کریں۔ اس کے بعد اسلام ہمیں اُس وسیع برادری کے حقوق کی طرف متوجہ کرتا ہے جس کے ہم سب ارکان ہیں۔

یہ ہیں وہ فرائض جن کی ادائیگی کی اسلام ہمیں تاکید کرتا ہے، جن کی بجاآوری کی وہ ہمیں ترغیب دلاتا ہے مسلمان کی زندگی کا اصل مقصد یہی ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ آج اگر اسلامی معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے، آج اگر اس میں ضعف و اضمحلال رونما ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے احکام شریعت کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔

جدید رجحانات اخلاقی اوصاف سے یکسر عاری ہیں۔ لوگ اس دور میں صرف ایک ہی دھن میں لگے ہوئے ہیں اور وہ دولت سمیٹنے کی دھن ہے۔ وہی ان کی جدوجہد کا ہدف اور اُن کی سعی و عمل کا مقصود ہے۔ جو شخص بھی اس کے حصول کے لیے جائز راہوں کو مسدود پاتا ہے وہ بلاتامل حرام ذرائع کو اختیار کر لیتا ہے۔ اور جو اس مقصد میں ناکام ہوتا ہے وہ اپنے دل میں دولتمندوں کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ بھڑکاتا ہے اور ان کے خلاف دولت ہی کی خاطر برسرِ پیکار ہوتا ہے۔ اس طرح سماج کے مختلف طبقے ایک دوسرے کے خلاف دست و گریباں ہو گئے ہیں۔ دولت پرستی کے اس اندھے جذبے نے روحانی اقدار اور انسانیت کے بلند مقاصد کو بالکل بے وقعت اور بے معنی بنا دیا ہے۔ جس نسبت سے لوگوں کی حرص بڑھتی ہے

اسی شدت اور غیظ و غضب کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔ عہد حاضر میں جو پیہم جنگ و جدال، فتنہ و فساد ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں وہ سب اسی حرص کے نتائج بد ہیں۔ ہمارے اس دور میں ایک شخص کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اُس کی عزت و آبرو باقی ہے یا نہیں، اُس کی آزادی محفوظ ہے یا سلب ہو چکی ہے، وہ اپنی رائے کا مختار ہے یا دوسروں کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا ہے۔ اُسے اگر کوئی فکر دامن گیر ہے تو صرف ایک کہ وہ پانی اور چارے میں دوسروں کے برابر کا حصہ دار ہو۔ لوگوں کے مصائب و آلام کی مدت بہت طویل ہو گئی ہے۔ لوگوں سے جو وعدے کیے گئے تھے وہ ابھی تک وعدے ہی ہیں، شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے۔ انہیں آج تک وہ چیز نہیں مل سکی جو انہیں سکون و اطمینان بخش دے۔ یہ دشمنی، یہ بغض و عناد، یہ ظلم و عدوان، یہ جبر و اکراہ اور انسانی اخلاق کے نوامیسِ عالیہ سے یہ تہی دامنی — یہ ہیں وہ اسباب جن کی بنا پر امتِ مسلمہ تہذیب جدید کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری خواہش کے علی الرغم یہ برائیاں اسلامی معاشرہ کے رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی ہیں۔ ہم اس بات سے خوفزدہ ہیں، کہ کہیں یہ خرابیاں اسلامی معاشرہ کے رگ و پے میں سرایت نہ کر جائیں۔ ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ خرابیاں ہمارے سماج میں مستقل طور پر جڑ نہ پکڑ لیں اور دنیائے مغرب کی طرح کہیں ہمیں بھی اُن زندگی بخش اقدار اور نیک مقاصد سے ہٹا نہ دیں جو ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ اور اس طرح ہم شقاوت و بدبختی کے عمیق غاروں میں دھکیل دیئے جائیں۔

اسلام اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بھائی بھائی بنیں۔ حق و انصاف کے نفاذ کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ جو کچھ مل جائے اُسی پر مطمئن ہوں اور جو نہ مل سکے اُس کی اُمید سے معمور ہوں۔ لیکن اس کی طلب میں نہ تو زیادتی کریں اور نہ ہی راہِ راست سے بھٹکنے پائیں۔ اپنے بھائیوں کے لیے جانی اور مالی ایثار کرنے سے قطعاً گریز نہ کریں۔ اگر ان پر کوئی مصیبت آ پڑے تو اُن کی دستگیری میں ہمیں کسی قسم کا تأمل نہ ہو۔ رنج و محن، راحت و آرام، ہر حالت میں اُن کا ساتھ دیں۔ ہمیں ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو ذیل کی آیت کی مصداق ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ　　　بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ انصاف و حسن سلوک

وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ ۔

اور قرابت داروں کی خدمت کرنے کا حکم دیتا ہے وہ بے حیائی بے ہودگی اور ظلم و زیادتی سے منع فرماتا ہے۔

اس جماعت کا شعار یہ ہو:

لا یؤمنُ احدکم حتیٰ یحبَّ لاخیہ ما یحبُّ لنفسہ ۔

تم میں سے کوئی صحیح معنوں میں مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہ کچھ پسند کرتا جو وہ اپنے لیے کرتا ہے۔

آج کی تہذیب پر مادیت غالب اور مسلط ہے، محسوسات اس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اور حرص وہوا کے بندھنوں نے اسے بُری طرح جکڑ رکھا ہے۔ آج دنیاوی فوائد و لذائذ کی پرستش کی جا رہی ہے۔ انسان کے اندر اب یہ احساس پوری طرح پرورش پا چکا ہے کہ حیاتِ انسانی کام و دہن کی لذت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ وہ جو کچھ کماتا ہے وہی اُس کی زندگی کا گوہر مراد ہے۔ اس طرز تفکر نے اب یہاں تک ترقی کی ہے کہ ایک انسان کو ایک ایسا حیوان قرار دیا ہے جس کا مقصد بجز پیٹ بھرنے کے اور کوئی نہیں جس نے نہ تو کبھی اس سطح سے بلند ہو کر سوچا ہے اور نہ ہی اس دائرہ سے باہر قدم رکھنے کی کوشش کی ہے۔

تہذیب جدید کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اکل و شرب، لباس اور اسی قسم کی دوسری جسمانی اور مادی ضروریات کے علاوہ ہر رابطہ کو توڑ دیں۔ اس کے علاوہ یہ تہذیب یہ بھی چاہتی ہے کہ ہر اُس چیز کا انکار کر دیں جو غیر مرئی ہے، نہ تو خدا کی خدائی کو تسلیم کریں اور نہ دین کی فرمانروائی کو۔ یہ تہذیب ہم پر یہ بھی لازم ٹھہراتی ہے کہ ہم اُن تمام انسانی اقدار کو ترک کر دیں جن میں حیوانیت شریک نہ ہو۔ اس لحاظ سے انسان میں نہ تو کوئی آگہی اور وقوف ہونا چاہیے، نہ ہی ارادہ و اختیار اور نہ ہی اخلاق و شرافت۔ اس نئے انسان کو چاہیے کہ وہ شفقت، مودت، صلہ رحمی اور اسی قبیل کی تمام باتوں کا مذاق اڑائے۔ یہ جدید انسان جب تمام ادیان کا انکار اور تمام انسانی فضائل سے اعراض کر چکتا ہے تو اُسے اکل و شرب میں شرکت کا حق بخشا جاتا ہے، یا یوں کہنا چاہیے کہ اُسے چارہ اور پانی نصیب ہوتا ہے، نہیں، بلکہ وہ صرف اس بات کا مستحق سمجھا جاتا ہے کہ اُسے آب و دانہ کی فراہمی کا وعدہ دلا کر ہانکا جائے خواہ یہ وعدہ وفا ہو یا نہ ہو۔

یہ ہے تمہاری تہذیب نَو اور یہ ہے مادیت اپنی آخری اور جدید ترین شکل میں۔

مسلمانوں کو اس تہذیب سے بچنا چاہیے اور اس امر کے لیے کوشاں رہنا چاہیے کہ اس سے کسی طرح نجات پائیں۔ اُن کے دین و ایمان نے اخلاق و مروّت اور عدل و انصاف کی جو بلند اقدار انہیں دی ہیں، انہیں انہی کو اپنانا چاہیے، اگرچہ اہلِ دنیا کی بیشتر تعداد اس دور میں ان حقائق کو جھٹلا رہی ہے۔

مسلمانو! فتنہ اور فساد کی اس کھبگاہ میں تمہیں صبر و ثبات سے کام لینا چاہیے۔ تمہیں اپنے اندر اعتماد پیدا کر کے اپنے دین و ایمان اور درخشاں ماضی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، تاکہ تم انسانیت کو اُس عظیم شر سے جو اُس کے ارد گرد چاروں طرف پھیلا ہوا ہے نجات دلا سکو اور نوعِ بشری کو تاریکی اور اندھیرے سے نکال کر روشنی اور نور میں لے آؤ۔

تمہارے شایانِ شان یہی چیز ہے کہ تم پوری انسانی برادری کو اخوت اور انصاف کی طرف بلاؤ، لوگوں کو دین و ایمان، نیکی اور بھلائی کی دعوت دو اور تم اُس فرض کو احسن طریق سے سرانجام دو جس کی قرآن نشاندہی کرتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ	تم ایک بہترین امت ہو جو تمام انسانوں کی خاطر بنائی گئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے منع کرتے ہو، اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

تعزیراتِ اسلامی

(مصطفیٰ احمد زرقاء پروفیسر قانون اسلامی لاء کالج شام)

تعزیر کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم لغوی لحاظ سے تعزیر کے معنی ہیں، باز رکھنا۔ تہذیب و شرافت سے بہرہ مند کرنا۔ یہ لفظ مدد اور نصرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (جو لوگ رسول پر ایمان لائے اور اس کی مدد و نصرت کی اور اس نور کی اتباع کی جو اس پر نازل کیا گیا ہے، یہی لوگ درحقیقت فلاح پانے والے ہیں) تعزیر میں مدد اور نصرت کا مفہوم بھی اس لیے شامل ہے کہ اس میں دشمن کے انسداد اور استیصال کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اصطلاحِ فقہ میں تعزیر اس سزا کو کہتے ہیں جو قانون میں بلحاظ مقدار و نوعیت بالکل مقرر نہ کر دی گئی ہو، بلکہ جس میں عدالت حالاتِ مقدمہ کے لحاظ سے کمی بیشی کر سکتی ہو۔

یہ سزا حدود و قصاص کے مقدمات کے ماسوا تمام ایسے جرائم اور افعالِ ممنوعہ کے ارتکاب پر دی جا سکتی ہے، جو مرتکب جرم کو زجر و توبیخ کرنے اور آئندہ اُسے جُرم سے باز رکھنے کا تقاضا کرتے ہوں۔

تعزیر کو اختیاری سزا بنانے کی مصلحت تعزیر کی نوعیت و مقدار کا تعین اربابِ قضا کو سونپ دینے میں مصلحتِ شرعی یہ ہے کہ جرائم اپنی اشکال و اقسام کے لحاظ سے غیر محدود ہیں۔ اور بسا اوقات ان کی ایسی نرالی قسمیں سامنے آتی رہتی ہیں جن کا پہلے وجود نہیں ہوتا بلکہ کبھی ایک ہی جرم نو بہ نو لبادے اوڑھ کر اور گوناگون ہتھکنڈے اختیار کر کے سامنے آتا ہے، جس کے انسداد اور بیخ کنی کے لیے ایک ہی نوعیت کی تدابیر کارگر نہیں ہو سکتیں بلکہ دوسرے مؤثر طریقوں کو بھی بروئے عمل لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ شریعت اسلامی نے اپنی گہری حکمت عملی کے پیشِ نظر معروف اور نمایاں جرائم کی ان اقسام، جو براہِ راست اسلام کے انتظامی نظام کی بنیادوں پر حملہ آور ہوتے ہیں، از روئے نص متعین کر کے ان کی سزائیں مقرر کر دی ہیں۔

اور ان کے علاوہ تمام جرائم کے استیصال و بندش کے لیے سزاؤں کی نوعیت اور مقدار کے اختیارات عام اربابِ امر کو تفویض کر دیئے ہیں تاکہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق زمان و مکان کے اختلاف، افراد کی حیثیات اور معاشرے کی تہذیبی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر جرم کی مناسب سزا مقرر کرنے میں آزاد رہیں۔ بعض لوگوں کو معمولی گوشمالی اور انتباہ ہی راہ راست پر لے آتا ہے۔ اور بعض موٹی کھال کے مجرم شدید عقوبت کا مزہ چکھے بغیر جرم سے دست کش ہونے پر رضامند نہیں ہوتے۔ طبیعتوں کے اسی تفاوت اور اثر پذیری کے فرق کی بنا پر شریعت حاکم کو اس امر کا مجاز ٹھہراتی ہے کہ وہ ایک ہی نوعیت کے فعل پر مختلف سزائیں نافذ کر سکتا ہے۔

حاکم اور قاضی مجرم کے لیے تعزیر کی جو صورت بھی تجویز کریں، اُس میں اپنے سامنے یہ اصول رکھیں کہ وہ شرعی سزاؤں سے مناسبت رکھتی ہو۔ یعنی ان میں انسانوں کو عذاب دینے اور وحشیانہ ایذا پہنچانے کا تصور نہ شامل ہو۔ بلکہ محض ان کو مؤدب و مہذب بنانے اور ان کی سرکشی کو روکنے کا مقصد پیش نظر ہو۔ جیسے تازیانے لگانا، قید کر دینا، جلا وطن کر دینا، مالی جرمانہ عائد کر دینا[1]، حتیٰ کہ اگر قاضی جرم کی شدت کے پیش نظر موت کی سزا بھی دینا

[1] مالی تاوان عائد کرنے کی سزا پر فقہاء میں شروع سے اختلاف چلا آتا ہے۔ کیونکہ اس سزا میں اس امر کا شدید اندیشہ ہے کہ ظالم حکام لوگوں کے اموال پر دست درازیاں شروع کر دیں اور جرمانوں کے نام سے لوگوں کے مال وصول کر کے خود ہڑپ کرنے لگیں۔

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ جرمانے کی سزا کو جائز ٹھہراتے ہیں۔

فقہائے شافعیہ میں سے محمد بن محمد القرشی المعروف بابن الاخوۃ نے امام شافعیؒ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک بعض بُرے افعال کے ارتکاب پر معین مالی جرمانہ واجب ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اونٹوں کی زکوٰۃ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ چالیس اونٹوں پر ایک بنت لبون یعنی اونٹ کا پورے دو سال کا مادہ بچہ دیا جائے۔ جو شخص یہ حق رضامندی سے ادا کر دے اُسے اللہ کے ہاں اجر ملے گا اور جو اس حق کو روکے گا اُس سے میں وصول کر کے چھوڑوں گا، اور اس وصولی کی شکل یہ ہو گی کہ اُس کے مال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا اور (جرمانہ کے طور پر) اس کے اچھے حصے سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ یہ ہمارے پروردگار کا فیصلہ ہے، محمد کی اولاد کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔"

امام شافعیؒ کا یہ مسلک ابن الاخوۃ نے اپنی کتاب "معالم القربۃ فی احکام الحسبۃ" میں بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر

چاہے تو اُسے اختیار حاصل ہے۔

تعزیر کے مراتب فقہائے حنفیہ کے نزدیک تعزیر کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ قاضی یا حاکم مجرم کی طرف ایک بار غضب آلود نگاہوں سے دیکھ لے یا اُسے مخاطب ہو کر یہ کہے: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو نے فلاں حرکت کی ہے۔" یہ سزا اس وقت اختیار کی جائے گی جب کہ جُرم معمولی درجے کی لغزش شمار ہوتا ہو اور اس کا مرتکب شرفاء اور اہلِ مروّت طبقے سے تعلق رکھتا ہو کیونکہ ایسے لوگوں کے لیے اتنی سی سزا بھی کافی اثر رکھتی ہے۔ تعزیر کا آخری درجہ سزائے موت ہے، جب کہ جُرم نہایت سنگین ہو، قومی و اجتماعی پہلو سے گہرے اثرات رکھتا ہو اور سوسائٹی کے اندر سے اُس کے رواج کو روکنا زیادہ سے زیادہ شدّت کا متقاضی ہو۔ فقہائے حنفیہ کا یہی مسلک معمول بہ چلا آ رہا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک بار فرمایا تھا: "لوگوں میں جس قدر قباحتیں اور برائیاں رونما ہوں گی اُسی قدر فیصلوں کی نئی نئی شکلیں پیدا ہوتی رہیں گی۔"[1] اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے دورِ خلافت میں مجرموں کو قید میں رکھنے کے لیے جیلوں کا نظام جاری کیا تھا۔

امام ابوالحسن الماوردی الشافعی نے "الاحکام السلطانیہ" میں بعض مجتہدین اور اصحابِ مذہب کے اقوال

ص۔ پر جتنی کتابیں تالیف کی گئی ہیں ان سب میں نہایت مفصل اور جامع کتاب یہی ہے۔ مؤلف رحمہ اللہ نے اسے بیس ابواب میں منقسم کیا ہے۔ اس کتاب کو حال ہی میں مستشرق روجن لیبی نے کیمبرج کے مطبع دار الفنون سے طبع کرا کر شائع کیا ہے اور انگریزی زبان میں اس پر ایک تلخیص اور پُر مغز مقدمہ بھی لکھا ہے۔

اس سلسلے میں میرا (یعنی مقالہ نگار کا) خیال یہ ہے کہ فقہائے متقدمین نے جس اندیشہ کی بنا پر مالی جرمانے عائد کرنے میں اپنے اختلافات کا اظہار کیا ہے وہ اندیشہ اب باقی نہیں رہا ہے۔ آجکل عدالتوں میں ایسے جرمانوں کا باقاعدہ سرکاری کاغذات میں اندراج ہوتا ہے۔ اربابِ منصب کے ہاتھ میں جانے کے بجائے وہ براہِ راست سرکاری خزانے میں جمع ہوتے ہیں اور پھر اُن کا متواتر سرکاری آڈٹ ہوتا رہتا ہے۔

[1] حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ قول علاؤالدین طرابلسی حنفی نے اپنی مشہور کتاب "معین الحکام" جزء سوم ص ۲۱ میں نقل کیا ہے۔ اسی سے ملتے جلتے الفاظ زیادہ سے بھی اُس کے ایک خطبے میں ماثور ہیں۔

آثار نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ارباب اجتہاد نے بعض جرائم میں ان کی نرمی اور سنگینی کے لحاظ سے سزاؤں کی مقداریں اور درجے متعین کئے ہیں۔ امام ماوردی نے ان تمام اقوال و مسالک کو بیان کرکے تصریح کردی ہے کہ "اگرچہ بظاہر سزاؤں کی تعیین اور ترتیب مستحسن معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی بنیاد کسی دلیل پر قائم نہیں ہے۔" یعنی فقہاء اور مجتہدین کی طرف سے بعض تعزیرات کی مقدار اور نوعیت کا تعین کر دینا واجب الاختیار نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی اصل شرعی سے ماخوذ ہے۔ بلکہ اس کا حد سے حد اگر کوئی فائدہ ہے تو صرف یہ ہے کہ اس سے حکام اور ارباب قضاء کو رہنمائی مل سکتی ہے۔ باقی رہا سزاؤں کی تحدید و ترتیب کا حق، تو وہ شریعت نے کسی ایک شخص یا اشخاص کے لیے مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ یہ علی الاطلاق ارباب امر کو حاصل ہے اور وہ اس میں وقتی و ملکی مصالح کے مطابق حسب ضرورت اضافہ و ترمیم کے مجاز ہیں البتہ تازیانہ لگانے کی آخری سزا شریعت نے متعین کر دی ہے۔ اس سے تجاوز کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ فقہاء کا فیصلہ ہے کہ تازیانے لگانے میں اس مقدار تک پہنچ جانا جائز نہیں جو اقل الحدود (چھوٹی سے چھوٹی حد) کے برابر ہو جائے۔ بلکہ ایک دو کوڑوں کی کمی رکھنا ضروری ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی حد چالیس کوڑے ہے جو غلام پر قذف یا شراب نوشی کے جرم میں نافذ ہوتی ہے اور آزاد کی نصف سزا کے برابر ہے۔ فقہاء کے اس خیال کا ماخذ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ:

"من بلغ حداً فی غیر حد، فھو من المعتدین (جس نے حد مارنے کے جرموں کے علاوہ کسی دوسرے جرم میں اتنی سزا دی کہ وہ حد تک پہنچ گئی، تو وہ زیادتی کرنے والوں میں سے ہے)۔" تازیانہ کی سزا کو اگر سنگین کرنا مقصود ہو تو اسے کوڑوں میں اضافہ کرنے کے بجائے دوسری سزاؤں مثلاً حبس اور جرمانے کی سزا سے شدید کیا جاسکتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ تعزیر کو حد سے بڑھا دینے اور شدید کر دینے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں بشرطیکہ ضرورت مجرم کی سخت سرکوبی اور استیصال کا تقاضا کر رہی ہو۔ اس بارے میں امام مالک رحمہ اللہ کا استدلال معن بن زائدہ والی روایت سے ہے، جس میں آتا ہے کہ معن بن زائدہ نے بیت المال کی جعلی مہر بنا کر بیت المال کے محافظ سے کچھ مال وصول کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس معاملے کا علم ہوا تو آپ نے معن بن زائدہ کو سو کوڑے مارے اور قید کی سزا دی۔ اس نے دوسری بار پھر یہی حرکت کی۔ حضرت عمرؓ نے پھر اسے سو کوڑے کی سزا دی۔ تیسری بار پھر وہ اسی جرم میں ملوث ہوا تو حضرت عمرؓ

نے اُسے سو کوڑوں کی سزا کے علاوہ ملک بدر کر دیا۔

مستوجبِ تعزیر ہونے کا ضابطہ بلاشبہ تعزیر بتقاضائے مصلحت حکام و قضاۃ کی صوابدید پر موقوف کر دی گئی ہے، اور اس میں ائمہ نے نفس کوئی مقدار یا نوعیت ثابت نہیں ہے۔ لیکن سبب سزا کی تحدید یعنی کیفیتِ جرم کی تشخیص جو کسی فرد کو مستوجبِ تعزیر ٹھہراتی ہے، لازمی ہے۔ فقہائے امت نے اس بارے میں پوری چھان بین اور غور و فکر کے بعد ایک عام ضابطہ مقرر کر دیا ہے جو درج ذیل ہے:

الضابطان کل من ارتکب منکراً او اذیٰ غیرہ بغیر حق بقول او فعل او اشارۃ یلزمہ التعزیر	اس سلسلے میں اصول یہ ہے کہ جو شخص فعلِ منکر کا مرتکب ہوتا ہے یا کسی دوسرے کو ناحق اپنی زبان سے یا عمل سے یا اشارہ و کنایہ سے ایذا دیتا ہے، اُس پر تعزیر لازم ہے۔

اسی عمومی ضابطے کے تحت وہ تمام جرائم آجاتے ہیں جو ملکی نظام میں اور پُر امن سوسائٹی میں رخنہ اندازی اور فساد انگیزی کا موجب ہوتے ہیں۔ خواہ وہ انسانوں کی باہم ایک دوسرے کی جانوں اور مالوں پر تعدی ہو، اور مار پیٹ، سب و شتم، دہشت انگیزی، ڈرانا دھمکانا، فریب دہی، جعل سازی، جھوٹی گواہی (FALSE TESTIMONY WITNESS)، اشیاء میں ملاوٹ کا کاروبار، غل و غش اور چالبازی اور لوٹ مار کے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہوں۔ خواہ وہ مذہبی شعائر کی توہین اور علانیہ ارتکابِ معصیت اور اشاعتِ منکرات ہو جیسے رمضان المبارک میں سرِ بازار خورد و نوش کی جسارت، مذہب کا مذاق اور زندقہ و فجور کی ترغیب اور شہری آداب و قواعد (PUBLIC MORALITY) کی خلاف ورزی اور بے حرمتی وغیرہ۔

مذہبی فرائض سے بے پروائی اور تغافل برتنا، بالخصوص تعلیم و تعلم میں کوتاہی کا ارتکاب کرنا بھی افعالِ منکرہ کی فہرست میں داخل ہے۔ اگر کوئی صاحبِ علم دوسروں کو علم سکھانے کا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے یا بے علم دینی علم کی ضروری مقدار کے حصول میں بھی تکاسل برتتا ہے تو یہ دونوں شریعت کی نگاہ میں مستحقِ تعزیر ہیں[1]۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم"

---

[1] حافظ منذری، مؤلف مختصر سنن ابی داؤد نے "الترغیب والترہیب" میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک روز...

علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے۔

کیا تعزیر معاف کی جاسکتی ہے؟ اگر موجب تعزیر جرم شہریوں کی باہم تعدی اور ضرر رسانی کی قبیل میں سے

۳۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا۔ اس میں آپ نے پہلے مسلمانوں کے ایک گروہ کی ستائش کی اور پھر دوسرے گروہ کو مخاطب ہو کر فرمایا: ان لوگوں پر کیا افتاد پڑی ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کو نہ دینی امور کی تعلیم دیتے ہیں، نہ وعظ و نصیحت کرتے ہیں، نہ ان کو نیکیوں کی تلقین کرتے ہیں نہ برائیوں سے ٹوکتے ہیں۔ اور نہ خود ہمسایوں کو یہ خیال آتا ہے کہ وہ از خود اپنے عالم ہمسایوں کی طرف رجوع کریں۔ ان سے علم سیکھیں، دین میں تفقہ حاصل کریں۔ وعظ و نصیحت سنیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ لوگوں کو اپنے ہمسایوں کو دین سکھانا چاہیے، دینی امور میں انہیں تفقہ سے بہرہ مند کرنا چاہیے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہنا چاہیے۔ اور اُدھر خود لوگوں کو بھی اپنے ہمسایوں سے علم حاصل کرنا چاہیے اور اپنے اندر فہم و فقاہت پیدا کرنا چاہیے۔ اگر ان باتوں کی پابندی نہ کی گئی تو میں ان سب کو دنیا میں بہت جلد سزا دوں گا" آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو سن کر کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور پوچھنے لگے: یا رسول اللہ! آپ کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ صحابہ ہی میں سے کچھ لوگوں نے جواب دیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے سخن اشعری قبیلہ کی طرف ہے۔ اس قبیلے کے لوگ خود تو صاحب علم و بصیرت ہیں مگر ان کے پڑوسی اُسی طرح بدو اور کندہ ناتراش ہیں۔ اشعریوں کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبے کی خبر ملی تو وہ فوراً آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ نے دوسرے لوگوں کی تعریف فرمائی ہے اور ہماری مذمت کی ہے۔ ہم سے کیا سرزد ہوا ہے؟ جواب میں آپ نے اپنی سابقہ تہدید کا اعادہ فرمایا وہ کہنے لگے: کیا ہم اپنے علاوہ لوگوں کو بھی سوجھ بوجھ والا بنا دیں۔ آپ نے پھر اپنے کلمات کو دہرایا۔ انھوں نے پھر یہی کہا کہ کیا ہم غیروں کے اندر بھی سوجھ بوجھ پیدا کر دیں۔ اس پر آپ نے پھر اپنی وعید کو دہرایا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا یا رسول اللہ آپ ہمیں ایک سال کی مہلت عنایت فرما دیں۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کو تعلیم ہمسایہ کے لیے ایک سال کی مہلت دے دی اور پھر قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی: لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ، كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭلَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (بنی اسرائیل میں جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے۔

نہ ہو بلکہ صرف مذہبی شعائر کی بے حرمتی اور ارتکابِ معصیت کی بنا پر ہو تو یہ تعزیر خالص شریعت کا حق شمار ہوگی۔ لیکن اگر جرم کسی کو مار پیٹ کرنے، گالم گلوچ دینے یا دوسروں کو کسی نوعیت کی ایذا پہنچانے کا ہو تو مجرم پر تعزیر کا حق بیک وقت دو طرف سے عائد ہوگا۔ ایک اس شخص کی دادخواہی کا حق جس کو مجرم کے ہاتھوں تکلیف پہنچی ہے اور دوسرا شریعت کا حق جو اُسے سوسائٹی کو پُرامن رکھنے اور شہریوں کی تادیب و اصلاح کے بارے میں اصولی طور پر حاصل ہے۔ دوسری صورت میں یعنی جب کہ تعزیر کسی مظلوم شخص کے حق کی بنا پر قائم ہو اور وہ شخص انتقام لینے کا مطالبہ کر رہا ہو تو عدالت کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ مجرم کی سزا کو معاف کر دے یا منسوخ کر دے۔ یہ انسانی حقوق کی صریح پامالی ہے اور عدالت کو انسانوں کے حقوق ساقط کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ البتہ اگر مدعی اپنی رضامندی سے مدعا علیہ کو معاف کر دے یا تعزیری سزا خالص شرعی حق کے تحت کسی مقدمے میں نافذ کی جا رہی ہو تو اس صورت میں بھی قاضی پر لازم ہے کہ صاحبِ حق کی طرف سے عفو و درگزر کے باوجود شرعی حق کو قائم کرتے ہوئے مجرم کو سزا دے۔ فقہاء کی صراحت کے مطابق قاضی یا حاکم محض اپنے حق کو معاف کرنے کا مجاز ہے، لیکن شہریوں کی تہذیب و اصلاح اور انسدادِ مفاسد کے سلسلے میں ریاست کو جو حقوق حاصل ہیں اُسے وہ معاف نہیں کر سکتا۔[1] اسی بنا پر فقہاء کا یہ فیصلہ بھی ہے کہ اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کو مارتا ہے اور وہ دوسرا شخص جواب میں ضارب کو مارتا ہے تو دونوں مستوجب تعزیر ہوں گے۔

طبری نے تاریخ الامم والملوک میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک بار حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے راستے میں جاتے ہوئے کسی فریادی کی پکار سنی، آپ جلدی کے ساتھ اس کی طرف لپکے اور فرمایا: "مددگار حاضر ہے"۔ چنانچہ آپ نے قضیے کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مستغیث نے ایک شخص کے ہاتھ سات درہم

۲- اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، انھوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ برا طرزِ عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا (المائدہ - ۷۸)۔ تعلیم و تعلّم میں کوتاہی کو اجتماعی جرم قرار دینا فی الواقع ایسا حیرت انگیز موقف ہے جو ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یا بعد تاریخ کے کسی دور میں بھی اختیار نہیں کیا گیا ہے۔

[1] الاحکام السلطانیہ از ابوالحسن ماوردی باب التعزیر

میں ایک کپڑا فروخت کیا۔ ان میں سے ایک درہم ناقص تھا۔ بیچنے والے نے اُسے واپس کرنا چاہا مگر خریدار نے لینے سے انکار کر دیا۔ جب کپڑے والے نے اسے واپس لے لینے پر اصرار کیا تو خریدار نے اُس کے ایک گھونسا رسید کر دیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس واقعہ کا گواہ طلب کیا۔ گواہ نے اس واقعہ کی تائید کی۔ حضرت علی نے گاہک کو زمین پر بٹھا دیا اور کپڑے والے کو قصاص لینے کا حکم دیا۔ اُس نے کہا: "امیرالمومنین! میں نے اسے معاف کر دیا۔" امیرالمومنینؓ نے کہا: "تو نے محض حق وصول کرنے میں احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے" اس کے بعد حضرت علیؓ نے خود آگے بڑھ کر کپڑے والے کو سات درّے مارے اور فرمایا: "ھٰذا حق السلطان" (یہ ریاست کا حق تھا) طبری جلد ۶ صفحہ ۔

اگر ستم رسیدہ بطور خود مجرم کا فعل معاف کر دے یا تعزیر کا نفاذ کسی ایسے مقدمے میں ہو رہا ہو جو حقِ شرعی کے تحت قائم کیا گیا ہو تو قاضی کو اگر یہ یقین ہو جائے کہ ارتکاب جرم کرنے والا قبل از وقت راہِ راست پر آ چکا ہے اور قاضی کا یہ خیال بھی ہو کہ درگزر کر دینا اس کے لیے مزید باعثِ اصلاح ہو گا تو اس استثنائی صورت میں وہ مجرم کو معافی دے سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کا ارباب عدل و قضاء کو یہ حق دے دینا کہ وہ مقدماتِ تعزیر میں (جس کی صورت اوپر گزر چکی ہے) سزا دیئے بغیر مجرم کو معاف کر دینے کے مجاز ہیں، حقِ جمہور میں دست اندازی کے مترادف نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، اربابِ عدل و قضا کو یہ اختیارات بلا شرط اور علی الاطلاق حاصل نہیں ہیں بلکہ صرف مصالح خصوصی کے پیشِ نظر ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم جدید فوجداری اور تعزیری قوانین اور تصوراتِ قانون کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جدید قوانین و دساتیر جو ہمارے ملکوں میں رائج ہیں یا دیگر ترقی یافتہ ممالک میں نافذ ہیں، صدر ریاست کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ قتل و ڈکیتی کے بڑے سے بڑے جرائم میں مجرموں کو معافی دے سکتا ہے۔ صدر ریاست کا یہ حق عفو (MERCY APPEAL) عدالتِ عالیہ کے فیصلے پر بھی بالاتری رکھتا ہے اور وہ جب بھی کسی قضیے میں "مصلحت" دیکھتا ہے اسے بلا تامّل استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ اور اس سب پر ستم یہ ہے کہ اس عفو و درگزر کو حقِ جمہور میں دست درازی کے مترادف نہیں گردانا جاتا۔

مذکورۂ بالا بیان سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اسلام میں تعزیری قوانین عام ملکی تعزیرات سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہیں بلکہ یہ انہیں کے تحت آتے ہیں۔ تعزیری قوانین میں تغیر پذیری کی خصوصیات موجود ہیں، اور وہ زمان و مکان کی قیود میں محصور نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے کہ وہ عصری تقاضوں کے مطابق نوعیت و مقدار کے ہر سانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔ انہی خصائص کی وجہ سے ارباب فقہ و قانون نے تعزیرات کو "مصلحتِ شرعی" کے دائرے میں شمار کیا ہے۔ مصلحتِ شرعی ان کے نزدیک حکومتِ اسلامی کا وہ عمل ہے جو اس نے مصلحتِ وقت اور مفادِ عامہ کے تحت کیا ہو اور خواہ اس فعل کے جواز میں کوئی مخصوص شرعی دلیل وارد نہ ہوئی ہو۔" اس تعریف کی رُو سے مصلحتِ شرعی دراصل مصالحِ مرسلہ یا استصلاح الحال ہی کی ایک قسم ہے۔ بلکہ فقہاء نے یہاں تک فرما دیا ہے کہ: کتابِ قانون کا بابِ تعزیر ہی فی الحقیقت شرعی مصلحت کے احکام کا نگران اور اسے انہیں کامیاب و نتیجہ خیز بنانے کا کفیل ہے تعزیری قوانین کی تدوین ہو سکتی ہے اس مقام پر قانون کے طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر شریعت نے تعزیر کی تعیینِ نوعیت و مقدار کو حکام و قضاۃ کی رائے پر چھوڑ دیا ہے تو کیا یہ تفویضی اختیارات مختلف النوع جرائم کے لیے مختلف سزائیں مقرر کرنے اور انہیں قانونی شکل میں مدون کرنے میں حائل نہیں ہوتے اور اس کی نفی نہیں کرتے ہیں جیسا کہ موجودہ دور میں فوجداری قانونِ عقوبات (PENAL CODE) میں یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ وقتی و ملکی داعیات کے تحت مختلف سزاؤں کا مجلّہ احکام وضع کیا جاتا ہے اور انہیں عدلیہ کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ قانون سازی اور سزاؤں کے احکام کی تدوین کا عمل خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت نے یہ معاملہ اربابِ امر کو تفویض کر رکھا ہے۔ اس لیے یہ قانون سازی اور حد بندی آزادئ رائے کو ختم نہیں کرتی بلکہ آزادئ رائے کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں فوجداری قوانین کی بہت بڑی تعداد اسلامی نقطۂ نظر سے جائز تعزیرات کے حدود میں داخل ہے بجز اس کے کہ حدود کے نفاذ میں بے اعتنائی برتی جاتی ہے یا قصاص کے مقدمات میں بعض صورتوں میں شریعت سے ہٹ کر قانون سازی کی گئی ہے۔ اسی طرح موجودہ قانون ساز ادارے فوجداری قوانین کی تدوین کے

ضمن میں کسی جرم کی سزا کے لیے اُس کی صرف ابتدائی اور آخری حدود کی تصریح کرتے ہیں اور باقی تمام جزئیات اور درمیانی مقداریں اربابِ عدل و قضا پر چھوڑ دیتے ہیں یہ بات بھی اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ پیسلیچر نے اربابِ عدل و قضا پر اعتماد کیا ہے اور ہر جرم کی موزوں سزا کی مقدار انہی کو تفویض کر دی گئی ہے۔ شریعت اسلامی نے ان تفویضی اختیارات کو بنیاد بنا کر سزاؤں کی تحدید کو ہر زمانے کے صاحبِ امر اداروں پر چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ زمان و مکان کے مطابق ان میں تصرف کرتے رہیں۔ فوجداری اور تعزیراتی قانون سازی کے وقت اربابِ امر کا سزاؤں کی تعیین و تحدید کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ انھوں نے اپنے قانونی اختیارات (LEGAL ATHORITY) کو روبعمل لاتے ہوئے گویا ان سزاؤں کو بالقوۃ نافذ کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ نفاذِ سزا وقوعِ جرم سے قبل ہوتا ہے لیکن اس کا فائدہ یہ ہے کہ مجرم اقدامِ جرم سے قبل ہی اپنی سزا کی نوعیت و مقدار سے آگاہ رہے گا۔ اب یہ بدیہی امر ہے کہ قبل از وقوعِ جرم سزا کا معین کر دینا بھی انہی اختیارات کے اندر ہے جو تعیینِ سزا کے باب میں شریعت نے اربابِ امر کو ہمہ وقتی سونپ رکھے ہیں۔

تعزیر ذریعۂ اصلاح ہے | خاتمۂ بحث پر ہم بیروت کے مشہور سکالر ڈاکٹر صبحی محمصانی ایڈووکیٹ کی کتاب "النظریۃ العامۃ للموجبات والعقود" کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جو ڈاکٹر موصوف نے اصولِ تعزیر کی بحث میں ایک نوٹ کی صورت میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

> "آپ نے اس سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ شریعتِ اسلامی میں تعزیر ایک ایسا لچکدار وسیلۂ عدل ہے جو صاحبِ امر کے میدانِ عمل کو وسیع کرتا ہے اور اُسے یہ مواقع فراہم کرتا ہے کہ وہ عمومی مصلحت کے تحت فساد انگیز عنصر کی اصلاح کر سکے من جملہ دوسرے دلائل کے یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ شریعت اسلامی جمود اور ٹھہراؤ کے اس اتہام سے بری ہے جو بعض لوگ اس پر دیدہ دلیری سے لگاتے ہیں۔ بلکہ یہ عصری مصالح کے مطابق ایک تغیر پذیر اور وقتی ضروریات کو بدرجۂ کامل بروئے کار لانے والی شریعت ہے۔ اسی طرح منجملہ دوسرے وسائل کے تعزیر بھی ایک ایسا وسیلہ ہے جو قاضی کو فوجداری احکام کی تنفیذ میں ہر واقعہ کے مطابق اور ہر مجرم کے حسبِ حال پوری آزادی سے بہرہ مند کرتا ہے تاکہ وہ سزا کی اصل غرض و غایت تک پہنچ سکے۔ اور سزا کی غرض و غایت یہ ہے کہ مجرم خود بھی اپنے جرم سے باز آ جائے اور اُس کے ہم جنس اس کی تقلید سے دامن کش ہو جائیں۔"

رسائل و مسائل

مسئلہ اجتہاد کے بارے میں چند شبہات اور ان کا ازالہ

[پچھلے دنوں بین الاقوامی مجلسِ مذاکرہ میں پوری دنیا کے اہلِ علم حضرات شرکت کی غرض سے لاہور تشریف لائے۔ ان میں مسلم و غیر مسلم، دونوں شامل تھے۔ مجلسِ مذاکرہ کے انعقاد کے دوران اور اس کے بعد یہ حضرات پاکستان کے اصحابِ فکر سے برابر ملتے رہے اور ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ اور طریقِ کار کو سمجھنے سمجھانے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ اسی سلسلہ میں بہت سے غیر ملکی مفکرین جماعت اسلامی کے زعماء خصوصاً مولانا مودودی سے بھی ملنے کے لیے وقتاً فوقتاً دفتر میں تشریف لاتے۔ یہ ملاقاتیں بڑی ہی دلچسپ ہوتیں۔ انہیں حضرات میں ایک نامور شخصیت ولفرڈ کینٹ ول سمتھ (WILFERED CANTWELL SMITH) کی تھی۔ ان کے نام اور کام سے ہمارے ملک کا انگریزی دان طبقہ بخوبی واقف ہے۔ یہ صاحب پہلے علی گڑھ کالج میں اسلامی تاریخ کے پروفیسر تھے اور اس کے بعد ایف سی کالج، لاہور سے وابستہ ہوئے۔ اب یہ کینیڈا کی ایک مشہور یونیورسٹی میکگل (MCGILL) میں شعبۂ اسلامیات کے صدر ہیں۔ ان صاحب کے طرزِ فکر میں چند سالوں سے نمایاں فرق واقع ہوا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے جو کتاب "ہند میں جدید اسلام" کے نام سے لکھی اُس میں اشتراکی نقطۂ نگاہ پوری طرح نمایاں تھا۔ لیکن زیادہ مدت گزرنے نہ پائی تھی کہ اُن کے فکر و نظر میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوئی چنانچہ اب وہ مذہب اور اُس کی پیش کردہ اقدارِ حیات کو انسانی زندگی کی صحیح نشوونما کے لیے نہایت ضروری اور اہم قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے عہدِ حاضر کے مسلمانوں کی بیداری اور ان کی مختلف تحریکات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے متعلق کئی ایک کتابیں بھی لکھ چکے ہیں۔ ذیل کا خط سمتھ صاحب کی مولانا سے ایک اہم ملاقات کی یادگار ہے۔ اصل خط انگریزی میں ہے۔ یہاں صرف اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ]

مخدومی :

تسلیم و آداب۔ یہ محض آپ کی ذرہ نوازی تھی کہ آپ نے مجھے پچھلے ہفتہ شرف باریابی بخشا۔ آپ کی اس کرم نوازی کا میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نے اس بالمشافہ گفتگو سے بھرپور استفادہ کیا۔ سب سے زیادہ مجھے اس بات کی مسرت ہوئی کہ مجھے آپ سے بہ نفس نفیس ملنے کی سعادت نصیب ہوئی اور اس طرح میں آپ کے طرزِ فکر اور طرزِ استدلال کا زیادہ قریب سے مطالعہ کر سکا۔ یہ فوائد آپ کی کتب پڑھنے سے ممکن ہے اس حد تک حاصل نہ ہوتے۔

دورانِ گفتگو میں چونکہ آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ مجھے اسلام اور اس کے بارے میں اپنی پیش کردہ تصریحات کے سمجھنے میں راہنمائی فرمائیں گے۔ اس لیے مجھے جرأت ہوتی ہے کہ آپ سے چند عنایات کا مطالبہ کروں۔ آپ کو تکلیف نہ ہو تو آپ براہِ کرم مجھے اپنے اُس مقالہ کے عربی اور اردو تراجم بھیج دیں جو آپ نے مجلسِ مذاکرہ میں مسئلۂ اجتہاد پر پیش کیا تھا۔ میں نے اس کے انگریزی ترجمہ کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا۔ جس طریق سے آپ نے قانونِ الٰہی کے معنی و مفہوم کا تعین کیا ہے اور اسلام کو اسی قانونِ ربانی کے سامنے سرنگوں ہونے کی حیثیت سے پیش کیا ہے، وہ میرے نزدیک بڑا دلاویز اور دلکش ہے اور اس سے میں خاص طور پر متاثر ہوا ہوں۔ یہ نکتہ اتنا اہم ہے کہ میرے دل میں اب قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ میں ان عربی اصطلاحات کو پورے غور سے دیکھوں جن میں اس نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہی حال مقالہ کے دوسرے اہم مقامات کا بھی ہے۔ اگر آپ کے پاس اس مقالہ کے دونوں تراجم کی زائد کاپیاں موجود ہوں تو ارسال فرمائیں تاکہ میں انہیں مطالعہ کر سکوں۔

اس سلسلے میں ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہوتا ہے: انگریزی ترجمہ میں آپ نے قانونِ الٰہی کے ماننے اور اُس کے مقابلے میں اپنی خودمختاری سے دست بردار ہو جانے کا نام اسلام رکھا ہے۔ اس سے پیشتر میں اسلام سے مراد صرف خدا کے حضور میں سرِ نیاز خم کرنے کے لیتا تھا مگر آپ کے نزدیک یہ دونوں ایک ہی ہیں اور ان میں کوئی تعارض نہیں۔ کلوکیم میں میں نے جو مقالہ پڑھا تھا اُس میں میں نے انہیں دو مختلف چیزوں کی حیثیت سے پیش کیا۔ چونکہ میرے مقالے کے اردو اور عربی کے مترجمین میرے نقطۂ نظر کو

اچھی طرح سمجھ نہ سکے، اس لیے میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ صرف انگریزی مقالے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ ممکن ہے یہ صراحت میری اُس اُلجھن کو صاف کر دے جس کا اظہار میں نے آپ سے ملاقات کے وقت کیا تھا اور اس ضمن میں گزارش کی تھی کہ میرا خیال یہ تھا کہ جماعت اسلامی انسان کے خدا سے تعلق پر توجہ دینے کی بجائے صرف مذاہب کے خارجی مظاہر پر زور دیتی ہے۔ اس کا جو جواب آپ نے دیا، اُس نے مجھے سوچنے کے لیے مواد دیا ہے اور غور و خوض پر ابھارا ہے۔ تاہم آپ نے مطبوعہ مقالہ میں جو موقف اختیار کیا ہے اس سے پھر یہی مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ کیا مسلمانوں کے دین کی اصل روح خدا کے ساتھ تعلق (جھکنا۔ اسلام) سے زیادہ شریعت کے ساتھ وابستگی میں ہے؟

اسی سے پھر ایک اور مسئلہ بھی سامنے آتا ہے یعنی مسلم قوم کا دوسری مذہب پرست اقوام کے ساتھ تعلق کی صحیح نوعیت۔ میرے غور و فکر میں آپ کا یہ فقرہ سُن کر ایک طرح کا تموّج پیدا ہوا کہ ایک مسیحی کے نزدیک خنزیر کا گوشت کھانا ایک معمولی بات ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں اس کا مفہوم اچھی طرح سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں بحیثیت ایک عیسائی یہ اعتقاد رکھتا ہوں کہ اگر میں خنزیر کا گوشت کھانا چاہوں تو اس بارے میں مختار ہوں اور کوئی چیز اس راہ میں حائل نہیں ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر میں ایسا کروں تو آپ کو بطورِ مسلمان میری اس حرکت سے تکلیف ہوگی۔ کیونکہ آپ کے نقطۂ نظر کے مطابق شریعت، خدائی، ہمہ گیر اور آفاقی قانون ہے۔ کیا اللہ کے قانون کی پیروی سب پر واجب نہیں، اگرچہ صرف مسلمان ہی اسے پورے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ اگر میں جھوٹ بولوں تو آپ کو میرا یہ فعل ناگوار گزرے گا۔ کیا کوئی اخلاقی ضابطہ ایسا بھی ہے جو سارے انسانوں پر نافذ ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کچھ اصول و ضوابط ایسے ہیں جن کی پیروی صرف مسلمانوں پر لازم ہے۔؟

میں سگریٹ اور شراب پینے کا عادی نہیں۔ میرے اس طرزِ عمل سے میرے مسلمان دوست بڑے مسرور ہوتے ہیں کہ میں اُن کے مذہب کے ان دو اصولوں پر کاربند ہوں، اگرچہ میں یہ کام خود اپنے ذاتی اعتقادات کے مطابق کرتا ہوں۔ میں نے زندگی بھر نہ تو کبھی سگریٹ کو چھوا ہے اور

نہ ہی کبھی شراب پی ہے۔ مَیں محسوس کرتا ہوں کہ یہ بہتر ہے (اور اس بنا پر خدا کو زیادہ پسندیدہ ہے) کہ آدمی شراب نہ پئے۔ اور یہ بات ایک مسلمان کے لیے اسی قدر صحیح ہے جتنی کہ ایک عیسائی، ہندو، یا دہریہ کے لیے۔ مگر مسلمان کے معاملہ میں ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ایک شرابی مسلمان نہ صرف اس فعل سے اپنی صحت کو تباہ کرتا ہے بلکہ وہ اپنے اندر ایک مجرم ضمیر کو بھی پالتا ہے کیونکہ وہ شراب پی کر ایک ایسی حرکت کا مرتکب ہوتا ہے جس کو وہ اپنے عقیدہ کی بنا پر حرام تسلیم کرتا ہے اب حل طلب مسئلہ یہ ہے، کیا آپ حضرات بحیثیت مسلمان اس بات سے زیادہ خوش نہ ہوں گے اگر میں یا میری طرح کے دوسرے غیر مسلم شریعت کے قانون کی پابندی کریں۔ اگرچہ مجھے یہ اعتراف ہے کہ غیر مسلم ہونے کی وجہ سے ہم اتباع شریعت کی ساری ذمہ داریوں سے کماحقہٗ عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ممکن ہے آپ کا اس بارے میں جواب یہ ہو کہ میں بحیثیت عیسائی عیسائیت کے پیش کردہ قوانین و ضوابط کی پیروی کروں۔ لیکن آخر ایک ہندو اور ایک ملحد اس معاملہ میں کونسا طرزِ عمل اختیار کرے۔ کیا ایک منکرِ خدا جو ایماندار ہے، اُس خدا پر ایمان لانے والے فرد سے بہتر (اور اس وجہ سے خدا کی نظر میں زیادہ پسندیدہ) نہیں، جو بددیانت ہے؟ مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں نے آپ کو بے جا تکلیف دی۔ اور شاید میں نے آپ کی مروت سے اپنے حق سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے مگر میں نے یہ جسارت صرف اسی لیے کی ہے کہ میں نے اپنی ساری زندگی ان مسائل کے سمجھنے میں صرف کی ہے۔ خصوصاً وہ مسائل جن کے حل ہو جانے سے قوموں کے درمیان صلح و آشتی کے امکانات بڑھ سکتے ہیں۔

آپ کا مخلص

ولفرڈ کینٹ ول سمتھ

جواب :۔ محترمی ! مسٹر اسمتھ،

آپ کی یاد فرمائی کا میں بہت شکر گزار ہوں۔ آپ کے حسبِ طلب اپنے مقالے کی عربی اور اُردو کاپی ارسال کر رہا ہوں۔ اصل مقالہ اُردو میں لکھا گیا تھا۔ عربی اور انگریزی (VERSIONS) دونوں

اس کے ترجمے ہیں۔ آپ چونکہ اُردو سمجھتے ہیں اس لیے بہتر یہی ہو گا کہ آپ اردو مقالے ہی پر اعتماد کریں اس کے ساتھ میں وہ نوٹ بھی بھیج رہا ہوں جو اپنے مقالے پر تنقیدوں کے جواب میں میں نے کلوکیم میں پیش کیا تھا۔

آپ کے ذہن میں میرے مقالے کو دیکھ کر "اسلام" کے معنی کے متعلق جو سوال پیدا ہُوا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے معنی تو بے شک خدا کی اطاعت ہی کے ہیں، لیکن اس اطاعت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ خدا کے قانون کی اطاعت کی جائے، کیونکہ خدا کو ماننا اور اس کے قانون کو نہ ماننا دونوں باہم متناقض (INCOMPATIBLE) ہیں۔ میں نے جس ترتیب سے اس مسئلے کو واضح کیا ہے آپ اسی ترتیب سے اس پر غور کریں تو صحیح پوزیشن آپ کے سامنے واضح ہو سکے گی۔ ترتیب یہ ہے:

(۱) قرآن خدا کو صرف معبود ہی نہیں قرار دیتا بلکہ قانونی حاکم (LEGAL SOVEREIGN) بھی قرار دیتا ہے،

(۲) خدا کی خداوندی کے یہ دونوں لوازم تصورِ توحید کے لحاظ سے ایسے غیر منفک ہیں کہ ان میں سے جس کا بھی انکار کیا جائے وہ لازماً خدا کا انکار ہے۔

(۳) اس عقیدے کی رو سے خدا کے جس قانون کی اطاعت لازم آتی ہے اس سے مراد قوانین طبعی نہیں ہیں بلکہ وہ قانون ہے جو خدا اپنے رسولوں کے ذریعہ سے دیتا ہے اور جس کا مقصد ہماری فکر و نظر اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں ہمارے رویّے کو درست کرنا ہے،

(۴) قرآن کی دعوت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ انسان اس ہدایت اور اس قانون کے آگے سرِ تسلیم خم کریں جو خدا نے انبیاء کے ذریعہ سے عطا فرمائی ہے اور اس کے مقابلے میں اپنی خود مختاری سے دستبردار ہو جائیں۔ اسی چیز کا نام قرآن کی زبان میں "اسلام" ہے۔ (بالفاظ دیگر اگر کوئی شخص کہے کہ میں خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں، لیکن وہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی دی ہوئی ہدایت اور ان کے پہنچائے ہوئے احکام کے آگے SUBMIT نہ کرے، نہ ان کے مقابلے میں اپنی خود مختاری کے دعوے سے دست بردار ہو، تو قرآن اس کو "مسلم" قرار دینے کے لیے تیار نہیں ہے)۔

اس ترتیب سے آپ معاملے کو سمجھنے کی کوشش کریں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ سوال جو آپ نے اٹھایا ہے کہ DOES THE HEART OF A MUSLIM'S FAITH NOT LIE IN HIS RELATION (SUBMISSION, ISLAM) TO GOD RATHER THAN TO HIS RELATION TO THE SHARIAH.

یہ سوال درحقیقت پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ مسلمان کا خدا سے "اسلام" SUBMISSION کا تعلق آپ سے آپ خدا کے قانون (یعنی شریعت) سے "اسلام" کے تعلق کی شکل اختیار کرتا ہے اور یہ اس کا ایسا فطری تقاضا ہے کہ اگر خدا کے قانون سے اسلام کا تعلق باقی نہ رہے تو پھر خدا سے اسلام (SUBMISSION) کا تعلق باقی رہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

— عیسائیوں کے لحم خنزیر استعمال کرنے کے متعلق میں نے جو بات کہی تھی وہ دراصل ایک دوسرے ہی سیاق و سباق میں تھی۔ میں آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ مسلمانوں کے لیے روح اسلام کے ساتھ شکل اسلام (FORM) کی اہمیت کیا ہے، اور کیوں اس شکل سے بے پرواہی یا انحراف کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان پھر روح اسلام سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اس بات کو میں نے بہت سی مثالوں سے آپ کے سامنے واضح کیا تھا۔ مثلاً یہ کہ ایک مسلمان اگر نماز چھوڑ دے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ان تمام فرائض سے منہ موڑتا چلا جائیگا جو خدا اور بندوں کے حق میں اس پر عائد ہوتے ہیں۔ چونکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اولین فرض جو اس پر عائد ہوتا ہے وہ نماز ہے اور اس کو فرض جانتے اور مانتے ہوئے جو شخص چھوڑ دے اس سے پھر کسی حق شناسی و فرض شناسی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح جن چیزوں کو اسلام میں حرام اور سخت گناہ قرار دیا گیا ہے ان کو حرام اور گناہ جاننے کے باوجود جو مسلمان ان کا ارتکاب کرے اس سے پھر آپ یہ امید نہیں کر سکتے کہ وہ کسی اخلاقی حد کو توڑنے اور کسی برائی کا ارتکاب کرنے سے باز رہ جائے گا۔ اس سلسلے میں میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ لوگ نماز چھوڑنے یا لحم خنزیر کھانے والے مسلمانوں کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں اور اس بات کا خیر مقدم کرتے

؎ کیا مسلمانوں کے دین کی اصل روح خدا کے ساتھ تعلق سے زیادہ شریعت کے ساتھ وابستگی میں ہے۔

ہیں کہ یہ مسلمان آپ سے قریب تر ہو گئے۔ لیکن آپ یہ اندازہ نہیں کرتے کہ جن حدوں کو پھاند کر اور جن احترامات (SANCTITIES) کو توڑ کر وہ آپ کے قریب پہنچا ہے ان سے تجاوز کرنے کے باعث وہ آپ کی اخلاقی سطح سے بدرجہا زیادہ پست سطح پر گر چکا ہے۔ آپ لوگوں کے نزدیک نماز سرے سے فرض ہی نہیں ہے، اور لحم خنزیر کھانا آپ کے ہاں ایک معمولی بات ہے۔ اس لیے آپ ترک نماز اور اکل خنزیر کے باوجود ان اخلاقی حدود پر قائم رہ سکتے ہیں اور ان اقدار (VALUES) کا احترام کر سکتے ہیں جو آپ کے ہاں معتبر ہیں۔ لیکن جو مسلمان یہ کام کرتا ہے وہ اتنی حدوں کو توڑ کر اور اتنی قیمتی اقدار کو پامال کر کے آپ کے مقام تک پہنچتا ہے کہ اس کے لیے پھر دنیا میں مشکل ہی سے کوئی چیز ایسی مقدس باقی رہ جاتی ہے جسے اپنی خواہش نفس، یا اپنے ذاتی مفاد کی خاطر پاؤں تلے روند دینے میں اسے کوئی تامل نہ ہو۔ اس لیے میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ لوگ اسلام کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کی ہمت افزائی کرنا چھوڑ دیں، کیونکہ یہ مسلم سوسائٹی میں سخت اخلاقی زوال کا مظہر ہے اور کسی انسانی معاشرے کا اخلاقی زوال درحقیقت اسی معاشرے کا نقصان نہیں بلکہ پوری انسانیت کا نقصان ہے۔

آپ کی یہ بات بجائے خود درست ہے کہ ہمارے نزدیک چونکہ ہر گناہ بجائے خود ایک برائی ہے اس لیے جس چیز کو بھی شریعت الٰہی نے گناہ ٹھہرایا ہے اس کو ہمیں کسی انسان کی زندگی میں بھی پسند نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری پوزیشن بالکل یہی ہے۔ ہم خدا کے تمام احکام کو تمام انسانوں کے لیے برحق مانتے ہیں اور جو انسان بھی ان کی خلاف ورزی کرتا ہے ہمیں اس پر رنج و افسوس ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک چاہے وہ گناہ ایک معمولی بات ہو، مگر ہمارے نزدیک وہ معمولی بات نہیں ہے۔ البتہ اگر ایک اسلامی حکومت میں کوئی غیر مسلم رہتا ہو تو ہم بعض احکام اسلامی کا اسے بالجبر پابند بنانے کی کوشش کریں گے اور بعض کے معاملے میں اسے آزاد رہنے دیں گے۔ مثلاً شرک ہمارے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے، لیکن اگر اس کے عقیدے میں شرک ہی صحیح ہے تو ہم اسے نہیں روکیں گے۔ اسی طرح لحم خنزیر کا استعمال ہمارے نزدیک قطعی حرام ہے، لیکن اگر وہ اسے حلال سمجھتا ہو تو ہم اسے اس چیز کے کھانے سے منع نہیں کریں گے۔

بخلاف اس کے ہم چوری سے، جھوٹی شہادت سے، غبن اور خیانت سے ضرور روکیں گے، کیونکہ یہ تمام انسانیت کے نزدیک متفق علیہ برائیاں ہیں اور ان سے فساد فی الارض رونما ہوتا ہے۔

مجھے آپ کی اس بات سے بھی اتفاق ہے کہ جو شخص جس حد تک بھی اخلاقی محاسن اور پسندیدہ اوصاف میں ہم سے قریب تر ہو اس پر ہمیں خوشی ہونی چاہیے۔ ایک آدمی کے غلط عقیدے کی برائی اپنی جگہ سہی لیکن بدکار اور بددیانت آدمی کی بہ نسبت اچھے اخلاق کا راستباز آدمی بہر حال بہتر ہے، اور اس سے ہم زیادہ اچھی طرح یہ توقع کر سکتے ہیں کہ کسی وقت وہ غلط عقیدے کی برائی بھی محسوس کر کے صحیح عقیدہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو سکے گا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ مودودی

(بقیہ اشارات)

کے لیے بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ صنعتی ترقی کا ہر قدم ذرائع میں اضافہ کا باعث بنتا ہے اور علم و فن ان کے استعمال سے خود بخود پھیلتے جاتے ہیں۔ جب پاکستان کا ہر شہری لکھنا اور پڑھنا سیکھ لے گا تو اس کے ذرائع لازمی طور پر بڑھ جائیں گے۔ ہم درحقیقت اپنے مدرسوں اور کالجوں سے جتنے حساب داں، اعداد و شمار کے ماہرین، مؤرخ، معاشین، سیاستدان، علوم طبیعیات، کیمیا کے رمز شناس اور علم الانسان کے جاننے والے پیدا کریں گے، اسی تناسب سے ہمارے ذرائع میں ترقی ہوگی۔

ایشیا کے سب سے پسماندہ ذرائع اُس کے پس ماندہ لوگ ہیں۔ پاکستان کی سب سے بڑی ضرورت تعلیم ہے۔ اسی کے پھیلنے سے ذرائع و وسائل میں ترقی ہوگی۔ علم اپنے وسیع تر معنوں میں یہاں کے باشندوں کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ ملکی پیداوار بڑھا کر ایک اچھا معیارِ زیست حاصل کر سکیں۔ یہ عمل مختلف ممالک میں کئی صدیوں سے جاری ہے اس میں اضافہ اور ترقی کی گنجائش ہر وقت موجود رہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس وقت دنیا کی پانچ فیصد فاقہ مست آبادی

بھی آرام و آسائش کا ایک معقول معیار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی تو اُس وقت انسان اپنے فارغ اوقات میں جب مالتھس اور اُس کے اندھے مقلدین کے ان پریشان کُن خیالات اور مایوس کُن افکار پر غور کریں گے تو وہ ان احمقانہ تصورات کو یاد کر کے بے اختیار ہنس دیں گے۔

ممکن ہے وہ لوگ جو اس دنیا میں رضیت باللہ ربّاً و بالاسلام دیناً و بمحمدٍ نبیاً کا نظریہ رکھتے ہیں، اور اسی کے سہارے زندگی گزارنے میں پوری نوعِ انسانی کی فلاح دیکھتے ہیں، ان کے نزدیک ان طویل اقتباسات میں دلچسپی کی کوئی چیز نہ ہو۔ وہ جب بھی انہیں پڑھیں گے تو ان کا تاثر ان کے بارے میں صرف یہی ہوگا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ایک غیر مسلم کی زبان سے اقرار اور اعتراف ہے۔ اور حقیقت میں ان اقتباسات کی حیثیت ہے بھی یہی، اس سے زیادہ انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ جو کچھ اللہ اور رسول نے فرما دیا ہے وہ سراسر حق ہے۔ اس کی صداقت غیر مسلم یا خود مسلمانوں کی تائید سے وابستہ نہیں۔ جو چیز خود ہی معیارِ حق ہو، اس کی صحت کو خارجی حالات و واقعات سے پرکھا نہیں جاتا بلکہ اس کے برعکس دنیا کے ہر قول اور فعل کو اسی ایک معیار پر جانچ کر دیکھا جاتا ہے کہ اُس میں حق کے کتنے اجزاء شامل ہیں، اور باطل کی کتنی آمیزش ہے۔ ہم نے اقتباسات کو یہاں ایک دوسرے نقطۂ نظر سے درج کیا ہے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہمارا روشن خیال تعلیم یافتہ طبقہ انہیں پڑھے اور پھر دیکھے کہ جن گمراہ کُن اور باطل افکار کی یہاں ضبطِ تولید یا عائلی منصوبہ بندی کے دلکش ناموں سے تبلیغ کی جا رہی ہے، اُن کی صحت سے تو خود اُن کے آئمہ مغرب بھی انکار کر چکے ہیں۔ اب اگر یہاں کے تجدد پسند حضرات ان باطل نظریات کو یہاں پھیلانا چاہتے ہیں تو یا وہ پرلے درجے کے بے وقوف اور کم علم ہیں یا وہ انتہائی درجے کے فریب کار اور چالاک ہیں۔ اگر یہ لوگ سب کچھ اپنی نافہمی کی بنا پر، یا جدید رجحانات سے عدم واقفیت کی بنا پر کر رہے ہیں تو یہ چیز بہت شرمناک ہے۔ ایک "روشن خیال" کے لیے قرآن سے ناواقف ہونا تو روشن خیالی کی سب سے بڑی دلیل ہے جس پر وہ فخر کا اظہار کر سکتا ہے، مگر اسے یہ بات کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی

کہ یورپ کے افکار و نظریات کے بارے میں اُس کی معلومات تازہ نہ ہوں اور اہلِ مغرب جن نظریات کو باطل ٹھہرا چکے ہیں وہ انہیں مسلمان قوم کو قبول کرنے کا مشورہ دے۔

ہم اپنے ملک کے روشن خیال طبقہ کے بارے میں یہ سوءِ ظن تو نہیں رکھتے کہ اُسے ان چیزوں کا علم نہیں البتہ اُس کے طرزِ عمل کو دیکھ کر ہمیں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اُس کی نیتیں ٹھیک نہیں۔ آدمی نے خدا کو دیکھا تو نہیں لیکن اُس کی قدرت سے ہی اُسے پہچانتا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کے افکار و نظریات، ان کے احوال و افعال اور اُن کے طرزِ بود و ماند کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک آدمی آسانی سے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ یہ حضرات خواہ اس کا زبان سے اقرار کریں یا نہ کریں، مگر دل سے ضرور اس بات کے متمنی ہیں کہ پوری امت ربّ العزت کی بندگی ترک کر کے اُن کی خدائی تسلیم کرے۔ یہ سارا ملک، اس کے تمام ذرائع و وسائل ان چند لوگوں کے لیے وقف کر دیئے جائیں۔ الغرض یہ ساری قوم ایک ایسی شکارگاہ بن جائے جس میں یہ لوگ جس طرح چاہیں شکار کریں، ان کی عیاشیوں اور بد معاشیوں پر، ان کی ہوس رانیوں اور لذت پرستیوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہ ہو۔ چنانچہ آئے دن کبھی آرٹ اور ادب کے نام پر، کبھی معاشرتی فلاح اور ضبطِ تولید کے نام پر، کبھی عائلی منصوبہ بندی اور معیارِ زیست کے نام پر جو فتنے اٹھائے جا رہے ہیں یہ سب وہ بہانے ہیں جن کی آڑ میں اس قوم کو ان چند لوگوں کے لیے شکارگاہ بنایا جا رہا ہے۔

ایک بات جس کے متعلق ذہن میں کئی بار سوال اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ آخر یورپ میں ساری برائیاں تو نہیں، وہاں کچھ اچھائیاں بھی ہیں مگر یہاں کے متفرنجین بار بار برائیوں پر ہی کیوں لپکتے ہیں۔ یورپ کے بہت سے ایسے ممالک ہیں جن میں معاشرتی فلاح کے لیے بہت مفید اور کارآمد اسکیمیں جاری ہیں۔ وہاں اجتماعی عدل کے حصول کے لیے کئی ایک مؤثر تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ وہاں شخصی آزادی کی حفاظت اور پاسبانی کے لیے دستور و قانون میں تحفظات موجود ہیں۔ وہاں تعلیم و تعلّم کا ایک اچھا نظام رائج ہے۔ وہاں غریب اور پسے ہوئے طبقوں کو اٹھانے کے لئے جدوجہد کی جا رہی ہے۔ وہاں جمہوریت اور جمہوری اقدار کا دلوں میں احترام ہے، اور

کوئی بڑے سے بڑا آدمی ان کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا وہاں لوگوں کا ایک سیاسی اخلاق اور کردار ہے اور اسی کے مطابق وہ اپنی اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں وہاں کے سربراہ کاروں کو اپنے وطن اور قوم سے محبت ہوتی ہے اور وہ اپنے ہم وطنوں میں اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ نہیں جماتے۔ وہ قوم کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ آخر ان ساری خوبیوں سے یکسر صرف نظر کرتے ہوئے ہمارے قائدین بار بار ان برائیوں کو ہی اپنانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں جن کے تلخ نتائج آج کسی ہوشمند آدمی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کا ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اس ملک میں قیصریت اور بادشاہت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ جس طرح پرانے وقتوں کے بگڑے ہوئے شہزادوں کے لیے سماج کے ایک طبقہ کو اخلاقی اور دینی اعتبار سے بگاڑ کر اسے ان کی ہوس پرستیوں اور عیش و عشرت کے لیے تیار کیا جاتا تھا اسی طرح اب پوری قوم کو بگاڑ کر ان چند لوگوں کے لیے عشرت کدہ بنا دیا جائے۔ یہاں انہیں کوئی پوچھنے اور ٹوکنے والا نہ ہو بلکہ پوری ملت متحد ہو کر انہیں دادِ عیش دے۔ یہ ہیں حقیقت میں ان لوگوں کے عزائم اور یہ ہیں ان کے دلپسند خیالات۔ اسی بنا پر یہ لوگ ایک طے بندھے منصوبے کے تحت وہ ساری چالیں چل رہے ہیں جن سے لوگ دین سے متنفر ہو جائیں اور اس طرح ان میں نہ تو اخلاقی حس باقی رہے اور نہ دینی حمیت۔ ساری کی ساری قوم بھیڑ بکریوں کا ایک ایسا گلہ بن جائے جسے یہ لوگ میکانکی طور پر جدھر چاہیں ہانک کر لے جائیں۔ چنانچہ دیکھیے اس مقصد کے حصول کے لیے کیا کیا تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں۔ یورپ کے پھیلائے ہوئے افکار و نظریات میں نہایت عیاری کے ساتھ ان چیزوں کو منتخب کیا جاتا ہے جن سے دینِ حق سے لوگوں کو منحرف کیا جا سکے۔ یہ تحریکِ ضبطِ ولادت بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ یورپ میں چونکہ اس تحریک کے پھیلنے سے اباحیتِ مطلقہ کا طوفان اٹھا، اسی وجہ سے اسے یہاں بھی پھیلانے کی کوشش ہو رہی ہے تاکہ عورت کو خاندانی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر کے اسے آزاد شہوت رانی کے لیے تیار کیا جائے ورنہ ذرائع و وسائل کا وہ سکون آفریں تصور جس کی آڑ میں اس برائی کو وہاں رواج دیا گیا تھا، اسے تو تاریخ نے خود ہی باطل ثابت کر دیا ہے۔

مطبوعات

ماہنامہ بتول زیر ادارت محترمہ حمیدہ بیگم صاحبہ و محترمہ درخشندہ کوکب صاحبہ۔ زر سالانہ ۵ روپے۔ جاری کردہ: حلقۂ خواتین جماعت اسلامی پاکستان، ملنے کا پتہ ۴۔اے، ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

اس سرزمینِ پاک میں جس سرعت اور برق رفتاری سے فحاشی، بے حیائی اور صنفی انارکی کا طوفان اٹھ رہا ہے وہ ملک کے ہر بہی خواہ کے لیے انتہائی پریشان کن ہے۔ اس سیلاب کی لپیٹ میں پہلے تو بازار اور دربار تھے لیکن اب اس ظالم نے گھروں کا رُخ کر لیا ہے۔ یہ صورتِ حال حددرجہ تشویشناک ہے اور ہر ہوشمند انسان کو اس کے تدارک کی فکر کرنی چاہیے۔ اگر خدانخواستہ اس کی بروقت روک تھام نہ کی گئی تو یہ ہمارے پورے معاشرہ کو تباہ کر دیگا اور پھر اس قوم کے اندر کسی خیر اور بھلائی کو فروغ دینے کی صلاحیت باقی نہ رہے گی۔ اس سلسلہ میں جس قدر ذمہ داری مردوں پر ہے، اس سے کہیں زیادہ یہ خواتین پر عائد ہوتی ہے۔ یہ وہ پُرآشوب وقت ہے جس میں ہر شخص کو جو کچھ کہ وہ کر سکتا ہے کر گزرنا چاہیے۔ چنانچہ وقت کی اس اہم پکار کے پیشِ نظر جماعت اسلامی حلقہ خواتین نے ماہنامہ بتول جاری کیا ہے۔ پرچہ کے مضامین میں کافی تنوع ہے۔ اداریہ، مقالات اور غزلوں کے علاوہ "آیئے کپڑے دھوئیں"، "امیری غریبی دسترخوان"، "کشیدہ کاری، خبر و نظر کے عنوانات کافی دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ اگر ان مفید موضوعات کے ساتھ ساتھ چند اور چیزوں کو بھی درج کر دیا جائے تو اس سے پرچہ کی افادیت بہت بڑھ سکتی ہے۔ مثلاً قرآن حکیم اور سنتِ رسُول میں معاشرتی زندگی کے لیے جن آیات اور احادیث ملتی ہیں ان کا اندراج بمعہ ترجمہ اور تشریح ضروری ہے۔ اس کے علاوہ امت نے سیرت و کردار کے جو بلند نمونے مسلم خواتین میں پیدا کیے ہیں اُن کا تذکرہ بھی مفید ہے۔ پرچہ کا موجودہ معیار حوصلہ افزا ہے اور اگر اس کو اور بلند کر دیا جائے تو یہ بہت زیادہ خیر و برکت کا موجب ہوگا۔

خـــالی صفحـــه

تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہء عمل

از

مولانا سید ابوالاعلی مودودی

یہ مولانا مودودی کی وہ تقریر ہے جو آپ نے فروری ۱۹۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع عام میں کی تھی - اس میں آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ جماعت اسلامی ابتدا سے آجتک کس پالیسی پر کام کرتی رہی ہے - کن کن مراحل سے گذر کر آئی ہے - تقسیم ہند سے قبل حالات کیا تھے - ان حالات میں جماعت کا طریق کار کیا تھا - تقسیم کے بعد حالات میں کیا تغیر رونما ہوا اور اسکے تقاضے کیا تھے - ایک لا دینی ریاست کو اسلامی ریاست میں بدلنے کے لئے جماعت کا فریضہ کیا تھا اور اس نے اسے کس حد تک انجام دیا - پیش نظر انقلاب اور اصلاح معاشرہ کی واحد صورت کیا ہے -

قیمت ۰-۱۲-۲ روپے

تزکیہء نفس

از

مولانا امین احسن اصلاحی

* انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد کیا ہے ؟
* انسانی معاشرے کی فلاح اور انسان کی نجات اخروی کا انحصار کس چیز پر ہے ؟
* کیا "تزکیہ" کا علم کوئی راز ہے ؟
* کیا "تزکیہ" کا اصل موضوع انسان کی محض انفرادی زندگی ہے ؟
* علم حقیقی کا سرچشمہ کہاں ہے ؟
* معرفت الہی کا صحیح مفہوم اور اسکے حصول کا صحیح طریقہ کیا ہے
* وہ کون سے عوامل ہیں جو معرفت الہی کے حصول میں حجاب اور سد راہ بنتے ہیں ؟

یہ جاننے کے لئے آپ مولانا اصلاحی کی تازہ کتاب تزکیہ نفس کا مطالعہ کیجئے

قیمت ۰-۸-۳ روپے

ملنے کا پتہ :

* مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ - لاہور
* سیل ڈپو مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی - مسلم مسجد